اِسلام کا اخلاقی اور روحانی نِظام

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

انجمن خدام القرآن سندھ (قرآن اکیڈمی) کراچی

اسلام کا اخلاقی اور رُوحانی نظام

انجمن خدام القرآن سندھ (قرآن اکیڈمی) کراچی

نام کتاب : اسلام کا اَخلاقی اور رُوحانی نظام

مقرر : ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

مرتب : اویس پاشا قرنی

طبع اول : جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ، جون 2010ء

زیر اہتمام : شعبۂ مطبوعات، قرآن اکیڈمی یاسین آباد، کراچی

ناشر : ناظم مکتبہ، انجمن خدام القرآن سندھ (قرآن اکیڈمی) کراچی

مطبع : القادر پرنٹنگ پریس کراچی:
021-32773652, 32723748

تعداد : 1100

ہدیہ : =/35 روپے

انجمن خدام القرآن سندھ کراچی رجسٹرڈ

فیکس: 5840009

publications@

www.quran

اسلام کا اَخلاقی اور رُوحانی نظام

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے ''اسلام کا نظامِ حیات'' کے موضوع پر اگرچہ متعدد بار اظہارِ خیال فرمایا ہے' مگر آج سے لگ بھگ بیس برس قبل اس ضمن میں ایک نہایت مربوط سلسلہ خطابات ارشاد فرمایا تھا۔ اس سلسلے کا ایک خطاب ''اسلام کا اخلاقی وروحانی نظام'' پیشِ خدمت ہے۔ جومرکز تعلّم وتحقیق' قرآن اکیڈمی' یاسین آباد' کراچی کے فیلو جناب اویس پاشا قرنی کی ترتیب وتخریج کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

خطبہ مسنونہ کے بعد تلاوتِ آیات:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝﴾ (الشّمس)

وقال اللّٰہ تعالیٰ:

﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝﴾ (الاعراف)

وقال عزوجل:

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ

حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿٢٨﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿٢٩﴾﴾ (الحجر)

وقال تبارك وتعالیٰ:

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٨٥﴾﴾ (بنی اسراءیل)

وفی الحدیث:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ ﷺ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ : مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِیْ يَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ ، فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ يَسْمَعُ بِهٖ، وَبَصَرَهُ الَّذِیْ يُبْصِرُ بِهٖ، وَيَدَهُ الَّتِیْ يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِیْ يَمْشِیْ بِهَا، وَلَئِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِيَنَّهٗ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِيْذَنَّهٗ)) (۱)

معزز حاضرین ومحترم خواتین!

جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہے' دو موضوعات کو یہاں پر جمع کیا گیا ہے: ''اسلام کا اخلاقی نظام'' اور ''اسلام کا روحانی نظام''۔ اس لیے کہ یہ دونوں انتہائی مربوط ہیں اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک ہی موضوع کی دو سطحیں (levels) ہیں۔ مؤخر الذکر کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مقدم الذکر سے بلند تر ہے' یا بالفاظِ دیگر وہ اسی مضمون کا عمیق تر پہلو ہے۔

خطاب کا پس منظر

مئی ۱۹۸۸ء کے ''حکمت قرآن'' میں میری چند تحریریں شائع ہوئی تھیں جو ان دونوں موضوعات سے متعلق ہیں۔ ''حقیقتِ زندگی''، ''حقیقتِ انسان'' اور ''عظمتِ صوم''۔ (۲) میرے ان مضامین میں بہت سے مسائل جو عرفِ عام میں تصوف سے متعلق ہیں' زیرِ بحث

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب التواضع۔

(۲) اب یہ تحریریں دو کتابچوں کی صورت میں دستیاب ہیں۔ (۱) زندگی' موت اور انسان (۲) عظمتِ صوم۔ شائع کردہ مکتبہ خدام القرآن لاہور (مرتب)

آئے ہیں۔ میں نے ''عرفِ عام'' کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ میں بعد میں عرض کروں گا کہ تصوّف کی اصطلاح دراصل بہت سے مغالطوں کا موجب بنی ہے۔ اگرچہ اس کا موضوع قرآن وسنت کے اہم موضوعات میں سے ہے' لیکن چونکہ ہمارے ہاں اس موضوع پر بہت ردّوقدح اور بحث تمحیص ہے' پھر ایک جانب غلو ہے تو دوسری جانب انتہا پسندی' لہٰذا میرے پاس بہت سے خطوط آئے اور بہت سے حضرات نے گفتگو کی' بعض جرائد نے اس پر تبصرے کیے۔ پھر رفقائے تنظیم اسلامی اور انجمن خدام القرآن کے احباب بھی مطالبہ کرتے رہے کہ اب میں اس موضوع پر اپنے خیالات کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کروں۔ تحریر کا تو مجھے اب تک موقع نہیں مل سکا' تاہم میں کوشش کروں گا کہ آج اپنی بات وضاحت سے آپ حضرات کے سامنے رکھوں۔ ان چند تمہیدی گزارشات کے بعد میں اس موضوع کے پہلے حصے کی جانب بڑھتا ہوں۔

(حصہ اول)

اسلام کا اَخلاقی نظام

اس عنوان کے ذیل میں تین باتیں ہیں جو میں ترتیب کے ساتھ آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

اسلام میں اخلاقِ حسنہ کی اہمیت

پہلی بات جو میرے نزدیک کَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ کے درجے میں ہے' یاد دہانی کے طور پر عرض کی جاتی ہے اور ہم میں سے کسی کے لیے یہ نئی بات نہیں ہوگی' لیکن اس گفتگو کا حق ادا نہیں ہوسکتا اگر ان حقائق کو تازہ نہ کرلیا جائے۔ وہ بات یہ ہے کہ اسلام میں اخلاق کی اہمیت اس درجہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا گیا: ((أَيُّ الْإِيمَانِ أَفْضَلُ؟)) اے اللہ کے رسول ﷺ فرمایئے کہ سب سے افضل' سب سے اعلیٰ اور سب سے عمدہ ایمان کون سا ہے؟ تو جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((خُلُقٌ حَسَنٌ))[۳] یعنی وہ ایمان جس کے ساتھ اخلاقِ حسنہ موجود ہوں۔ اسی طرح دوسری حدیث میں یہ قولِ مبارک سامنے آتا ہے: ((أَكْمَلُ

(۳) مسند احمد بن حنبل' مسند العشرة المبشرين بالجنة' تتمة مسند الكوفيين' حديث عمرو بن عبسة۔

الْمُؤْمِنِينَ اِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا))(٤) ''اہل ایمان میں سب سے زیادہ کامل الایمان شخص وہ ہے جواخلاق میں سب سے عمدہ ہے''۔ یعنی جس کے اخلاق سب سے اعلیٰ ہیں۔

ہمارے سامنے وہ آیاتِ قرآنیہ بھی ہیں جن میں نبی اکرم ﷺ کے اخلاقِ عالیہ سے متصف ہونے کا تذکرہ ہے' جیسے سورۂ نٓ (القلم) کی ابتدائی آیات جو بعض محققین کے نزدیک دوسری وحی ہے جو حضور ﷺ پر نازل کی گئی:

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝١ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝٢ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝٣ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝٤﴾

''نون۔ (اے نبی ﷺ) قسم ہے قلم کی اور اُس چیز کی جسے (لکھنے والے) لکھ رہے ہیں کہ آپ اپنے ربّ کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔ یقیناً آپ کے لیے تو کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ اور بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر ہیں۔''

اے نبی ﷺ اگر کوئی آپ کو مجنون کہہ رہا ہے تو آپ دل گرفتہ نہ ہوں۔ ان کے کہنے سے آپ مجنون نہیں ہو جائیں گے۔ آپ کے اخلاق تو خود منہ بولتا ثبوت ہیں کہ آپ کی شخصیت نہایت متوازن ہے۔ آپؐ کے اخلاق تو انتہائی اعلیٰ ہیں: ﴿اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾۔

بعض احادیث مبارکہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایمان اور اخلاقِ حسنہ لازم وملزوم ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا اللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِيِّ))(٥)

''مؤمن کبھی بھی طعنے دینے والا' لعنت ملامت کرنے والا' فحش گوئی کرنے والا اور بداخلاق نہیں ہوسکتا۔''

اور میرے نزدیک اس ضمن میں حرفِ آخر ہے وہ حدیثِ مبارکہ جو متفق علیہ ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ، وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ!)) ''خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے! دوسری مرتبہ پھر یہی فرمایا' تیسری مرتبہ پھر آپ ﷺ نے یہی فرمایا کہ خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے''۔ صحابہ کرامؓ لرز گئے ہوں گے کہ کون ہے وہ شقی شخص جس کے بارے میں حضور ﷺ تین مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر فرما رہے ہیں کہ

(٤) سنن الترمذی' کتاب الرضاع' باب ما جاء فی حق المرأة علی زوجها۔

(٥) سنن الترمذی' کتاب البر والصلة' باب ما جاء فی اللعنة۔ وشعب الایمان للبیهقی' الرابع والثلاثون من شعب الایمان' فصل فی فضل السکوت عن کل ما لا یعنیه ......

وہ شخص مؤمن نہیں۔((قِیلَ وَمَنْ یَا رَسُولَ اللّٰہِ ؟))''پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول کون؟''تو جواب میں یہ ارشاد ہوتا ہے: ((اَلَّذِی لَا یَأْمَنُ جَارُہٗ بَوَایِقَہٗ))(٦)''وہ شخص جس کی ایذارسانی سے اس کا پڑوسی چین یا امن میں نہیں ہے''۔ یہ حدیث بہت سے افراد نے پہلے بھی سنی ہوگی' لیکن اس اعتبار سے توجہ کریں کہ یہاں کسی گناہِ کبیرہ کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ یہاں شرک کا تذکرہ نہیں ہے' زنا کا تذکرہ نہیں ہے' چوری' ڈاکہ یا قتل کا تذکرہ نہیں ہے' صرف وہ شے بیان فرمائی جس کو ہم کج خلقی کہتے ہیں۔

میں یہاں متکلمانہ بحثیں نہیں چھیڑنا چاہتا' ظاہر ہے کہ یہاں یہ بات مراد نہیں ہے کہ جس شخص کی یہ کیفیت ہے وہ اسلام کے دائرے سے نکل گیا' وہ کافر ہوگیا---- بلکہ کوئی اور حقیقت ہے جس کی نفی محمد رسول اللہ ﷺ اس شدت سے فرما رہے ہیں۔ یہ قانونی ایمان نہیں ہے جس کی بنیاد پر کسی کو دنیا میں مسلمان سمجھا جاتا ہے' لیکن اسے حقیقت ایمان کہہ لیں یا ایمان کا تکمیلی درجہ کہہ لیں کہ اُس شخص کی محرومی پر رسول اللہ ﷺ نے تین مرتبہ اللہ کی قسم کھائی ہے جس کی ایذارسانی سے اُس کا پڑوسی چین میں نہیں ہے۔ اس موضوع پر آیاتِ قرآنیہ اور احادیث نبویہؐ کا بہت سا ذخیرہ سامنے لایا جاسکتا ہے مگر میں اسی پر اکتفا کرتے ہوئے اب دوسری بات کی طرف آرہا ہوں۔

قرآن حکیم کی روشنی میں اخلاقیات کی فلسفیانہ اساس

علم اخلاق یا اخلاقیات کے ذیل میں قرآن حکیم کی اہم ترین تعلیم جو اخلاقیات کی فلسفیانہ اساس بنتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے نفس میں اللہ تعالیٰ نے نیکی و بدی کا شعور الہامی طور پر ودیعت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج اپنی گفتگو کا آغاز سورۃ الشمس کی ان آیات سے کیا ہے: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا۝﴾ اور نفس انسانی کی قسم اور جیسا کچھ اللہ نے اس کو بنایا' سنوارا' اس کی نوک پلک درست کی۔ ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۝﴾ اور الہامی طور پر اس میں ودیعت کردیا فجور اور تقویٰ کا علم' نیکی اور بدی کا شعور' خیر اور شر کا امتیاز' اِثم و برّ کے مابین تمیز۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں نیکی اور بدی کے لیے خیر اور شر کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں' اِثم و برّ کے الفاظ بھی آئے ہیں' لیکن جامع ترین اصطلاح ہے ''معروف'' اور ''منکر''۔ معروف کے لفظی معنی ہیں جو شے جانی پہچانی ہے' جبکہ منکر کہتے ہیں اُس شے کو جس کے بارے میں اجنبیت محسوس کی جائے' جس کو پہچانا نہ جارہا ہو۔ اس اعتبار سے قرآن مجید نیکی

(٦) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب اِثم من لا یأمن جارہ بوایقہ یوبقھن ---

اور بدی کے بارے میں یہ بنیادی تصور سامنے لاتا ہے۔ میں یہاں نفسِ انسانی کی اصطلاح استعمال کر رہا ہوں‘ کیونکہ آیاتِ مبارکہ میں ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا۝﴾ آیا ہے۔ نفسِ انسانی میں جو بھی ارتقائی عمل ہوا ہے اس کے نتیجے میں حیوانات کے مقابلے میں ایک بالکل نئی استعداد اور صلاحیت پیدا ہوئی ہے اور وہ ہے خیر اور شر میں امتیاز کی صلاحیت۔ انسان اپنی اس فطرت کے اعتبار سے جانتا ہے کہ کیا خیر ہے اور کیا شر ہے؟ کیا نیکی ہے اور کیا بدی؟ ''خیر'' اس کے لیے معروف کے درجے میں ہے‘ جبکہ شر‘ برائی‘ بدی اور اِثم کو وہ منکر سمجھتا ہے۔ یہ درحقیقت خیر اور شر (good and evil) کے بنیادی تصورات ہیں جو پوری نوعِ انسانی کا مشترک اثاثہ ہیں‘ ان میں آپ کو کہیں کوئی فرق معلوم نہیں ہوگا۔ سچ بولنا ہر معاشرے میں‘ ہر دور میں خیر قرار دیا گیا اور جھوٹ بولنا ہر معاشرے میں‘ ہر دور میں بدی قرار پایا۔ ایفائے عہد ہر دور میں‘ ہر معاشرے میں نیکی قرار پائی اور وعدہ خلافی ہر دور میں‘ ہر معاشرے میں ایک برائی سمجھی گئی۔

اس کا ذرا تقابل کریں دوسرے الفاظ کے ساتھ۔ ایک ہے شریعت کے احکام اور اوامر ونواہی کہ یہ فرض ہے‘ یہ واجب ہے اور یہ حرام ہے‘ اس کے قریب نہ پھٹکو۔ واضح رہے کہ یہ دوسری منزل ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے لیے انسان کو وحی اور نبوت کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ مثلاً شراب حرام ہے‘ اس کا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ انسان طبعاً اس کا فیصلہ کر سکے‘ سؤر کا گوشت حرام ہے‘ اس کے بارے میں آج بھی لوگوں کو اشکال ہے کہ کیوں حرام ہے؟ یہ وہ چیزیں ہیں جو درحقیقت شریعت کے نقل پر مبنی ہیں۔ جو اللہ نے فرمایا اور جو اللہ کے رسول ﷺ نے ہم تک پہنچایا ہے ان احکام کی اطاعت ہمارے ذمے ہے‘ ان کی خلاف ورزی کو ہم معصیت قرار دیتے ہیں۔ جبکہ منکر کی اصطلاح اس سے وسیع تر مفہوم کی حامل ہے۔ یہ وہ پہلی منزل ہے جو اخلاقی اقدار (ethical values) پر مشتمل ہے۔ یہ اخلاقی اقدار پوری نوعِ انسانی کی مشترک متاع ہیں۔ ہر دور میں‘ تمام اقوام میں اور ہر علاقے میں ان کو مانا گیا ہے کہ یہ اچھائیاں ہیں‘ بھلائیاں ہیں‘ نیکیاں ہیں اور یہ برائیاں ہیں‘ یہ شر ہے اور یہ خیر ہے۔

اس اعتبار سے میں چاہتا ہوں کہ چند احادیث مبارکہ آپ کے سامنے رکھوں۔ بڑی پیاری حدیث ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: ((اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ)) (۷) ''اگر تمہیں کوئی اچھا کام کر کے خوشی ہو اور کوئی برا کام کر کے تمہیں خود ملال

(۷) مسند احمد بن حنبل‘ مسند العشرة المبشرين بالجنة‘ مسند الانصار‘ حديث ابی اُمامة الباهلی الصدّی......

ہو' تو تم مؤمن ہو'' ۔ یہ احساس گویا ایمان کی علامت ہے۔ معلوم ہوا کہ فطرت مسخ نہیں ہوئی' اس فطرت کے اندر خیر وشر کا امتیاز برقرار ہے۔ تبھی تو نیکی کر کے تمہیں مسرت ہوئی ہے' خوشی ہوئی ہے' اور کوئی کام اگر غلط ہو گیا ہے' کسی بدی کا ارتکاب ہو گیا ہے تو اس پر تمہیں خود گھٹن محسوس ہوئی ہے' تمہیں خود ضیق اور تنگی کا احساس ہوا ہے۔ یہ علامت ہے اس بات کی کہ فطرت اپنی صورت پر برقرار ہے' فطرت مسخ (pervert) نہیں ہوئی۔

اس سے بھی زیادہ حکیمانہ قول ہے محمد رسول اللہ ﷺ کا جو بہت ہی اہم فلسفیانہ حقیقت پر مشتمل ہے: ((وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِي نَفْسِكَ وَكَرِهْتَ أَنْ يَطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ)) (۸) ''گناہ وہ ہے جو تمہارے سینے میں کھٹکے اور تم اسے ناپسند کرو کہ وہ کام لوگوں کے علم میں آئے''۔ جیسا کہ سورۃ القیامۃ میں ''نفس لوامہ'' کی قسم کھائی گئی ہے:

﴿لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝﴾

''نہیں! میں قسم کھاتا ہوں روزِ قیامت کی۔ اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی۔''

یہ وہ ضمیر ملامت گر ہے کہ اگر ہم سے کسی برائی کا صدور ہو جاتا ہے تو ہمیں اس کی بنا پر اندر ہی اندر کوئی شے ملامت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ انگریزی میں اسے یوں تعبیر کرتے ہیں: ''My conscious is biting me'' یعنی ''میرا ضمیر مجھے کچوکے دے رہا ہے''۔ درحقیقت یہ اسی آیت مبارکہ کی ترجمانی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ ایک ہے انسان کا انفرادی ضمیر (individual conscious) جس پر مذکورہ بالا حدیث میں آنجناب ﷺ کی جانب سے گویا اظہارِ اعتماد کیا گیا ہے۔ یہ ضمیر ایک زندہ حقیقت ہے اور یہ علامت ہے اس بات کی کہ فطرتِ انسانی اپنی صحت پر برقرار ہے۔ آپ کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ میں یہ کام کر تو بیٹھا ہوں لیکن کسی کے علم میں نہیں آنا چاہیے۔ اس لیے کہ لوگ ملامت کریں گے' میرے بارے میں بری رائے قائم کریں گے۔ اسی طرح نوعِ انسانی کا ایک اجتماعی ضمیر (collective conscious) بھی ہے جس کا اثبات کیا جا رہا ہے۔ بہرحال احکامِ شریعت کے معاملے کو' جو ایک بلندتر منزل ہے' آج کی بحث سے خارج سمجھئے۔ لیکن جہاں تک انسانی اخلاقیات کا تعلق ہے تو ان چیزوں کے لیے انسان کسی تلقین یا تعلیم کا حاجت مند نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کی عطا ہے' یہ دولت اس کے پاس ہے۔

(۸) جامع الترمذی' کتاب الزھد' باب ما جاء فی البر والاثم۔

یہ پہچان‘ یہ فہم‘ یہ شعور‘ یہ امتیاز اس کے اندر ودیعت شدہ ہیں۔لہٰذا صداقت و امانت ہو‘ ایفائے عہد ہو‘ صلہ رحمی ہو‘ خدمتِ خلق ہو‘ یہ وہ بنیادی اوصاف ہیں جو مجمع علیہ ہیں۔

ایک حدیث ملاحظہ کیجیے‘ حضرت انس رضی اللہ عنہ جو نو برس تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی خادم کی حیثیت سے آپؐ کے ساتھ رہے ہیں‘ ان کی گواہی ہے کہ: قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِلاَّ قَالَ :((لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ ‘ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَھْدَ لَہٗ)) (۹) ”شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہوگا کہ ہمیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا ہو اور اس میں یہ الفاظ نہ وارد ہوئے ہوں:” جس شخص کے اندر امانت ڈاری کا وصف نہیں ہے اس کا کوئی ایمان نہیں اور جس میں ایفائے عہد کا مادہ نہیں اس کا کوئی دین نہیں“۔ امن‘ امانت اور ایمان کا قریبی رشتہ ہے اور لفظی طور پر بھی ان کا ایک ہی مادہ ہے۔ایفائے عہد کا دین سے جو معنوی ربط ہے اس کو سمجھ لیجیے‘ کہ درحقیقت دین بھی تو بندے اور رب کے درمیان ایک عہد ہے۔نماز میں ہم عہد کرتے ہیں:﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ○﴾(سورۃ الفاتحہ) ”پروردگار! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے“۔یہ ایک بڑا عہد ہے‘ جو شخص چھوٹے چھوٹے وعدے پورے نہ کرتا ہو وہ اتنا بڑا عہد‘ پوری زندگی کا عہد کیسے نبھائے گا؟ چنانچہ جس شخص میں امانت کا وصف نہیں اس میں ایمان نہیں‘ اور جس میں پاسِ عہد نہیں اس کا کوئی دین نہیں!!

اسی طرح خدمتِ خلق کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول یاد کیجیے:((خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَنْفَعُ النَّاسَ))(۱۰) ”لوگوں میں بہترین وہی ہیں جو لوگوں کو فائدہ پہنچائیں۔“

یہ جو بنیادی اخلاقیات ہیں‘ مثلاً صداقت‘ امانت‘ ایفائے عہد‘ صلہ رحمی‘ خدمتِ خلق‘ کمزوروں پر رحم‘ غریبوں کی امداد‘ یتیموں اور مسکینوں کی سرپرستی‘ یہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

﴿اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ① فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ② وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ③﴾ (الماعون)

”کیا دیکھا آپ نے اُس شخص کو جو جھٹلاتا ہے بدلے کو؟ پس وہی ہے جو دھکے دیتا ہے یتیم کو‘ اور نہیں ترغیب دیتا مسکین کو کھانا کھلانے کی۔“

---

(۹) رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔ مشکوٰۃ المصابیح‘ کتاب الایمان‘ الفصل الثانی۔ ومسند احمد بن حنبل‘ باقی مسند المکثرین من الصحابۃ‘ مسند انس بن مالک۔

(۱۰) شعب الایمان للبیھقی‘ فصل فی ذکر ما ورد من التشدید......

یہ وہ چیزیں ہیں جو فطرتِ انسانی کی جانی پہچانی ہیں' معروفات ہیں۔ ہر انسان جانتا ہے کہ یہ نیکی ہے اور اس کی ضد شر ہے۔

اعلیٰ اخلاق کے لیے جذبۂ محرکہ

یہاں تک تو سب جانتے ہیں' مگر عملاً جو مسئلہ درپیش ہے اس کا اظہار غالبؔ نے اس شعر میں کیا ہے ۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

اسی طرح فارسی کا ایک بہت تلخ شعر ہے' جو گزشتہ خطاب میں بھی بیان ہو چکا ہے ۔

اے دیانت بر تو لعنت از تو رنجے یافتم
اے خیانت بر تو رحمت از تو گنجے یافتم (۱۱)

ایک شخص جانتا ہے کہ سچ بولنا خیر ہے' مگر سچ بولنے سے نقصان ہو رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا شر ہے' لیکن جھوٹ بول کر لاکھوں کا نفع حاصل ہو رہا ہے۔ اب وہ کون سی قوتِ محرکہ (motivating force) ہو گی اور وہ کون سا جذبہ محرکہ ہو گا جو اسے آمادہ کرے گا کہ سچ بولنا ہے' چاہے جان بھی جانے کا اندیشہ ہو' چاہے اس کی وجہ سے نقصان ہو جائے۔ یہ ہے اصل مسئلہ علم الاخلاق کا' ورنہ جہاں تک بنیادی نیکی کا تصور ہے' انسان اندھا بہرا نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کو خارجی سماعت و بصارت عطا فرمائی ہے اسی طرح نفسِ انسانی کو باطنی بصیرت عطا فرمائی ہے کہ کیا خیر ہے' کیا شر ہے' کیا نیکی ہے' کیا بدی ہے! یہ جو جذبہ محرکہ ہے اس کے بارے میں بعض نظریات دنیا میں رائج ہیں ۔ خاص طور پر جدید مغربی دنیا میں فلاسفرز نے اخلاقیات کی جو اساسات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے' واقعہ یہ ہے کہ یہ اساسات بالکل ریت کی دیوار کی مانند ہیں' جن کے لیے کوئی استحکام نہیں۔ ہم یہاں ان کا مختصر تعارف پیش کر رہے ہیں۔

(ا) نظریۂ مسرت: یعنی نیکی سے خوشی ہوتی ہے' اچھے اخلاق سے انشراح ہوتا ہے۔ اس کی جزوی صداقت میں خود نبی اکرم ﷺ کی احادیث کی روشنی میں بیان کر چکا ہوں۔ لیکن سوال یہ

---

(۱۱) اے دیانت تجھ پر لعنت ہو' تجھ سے میں نے سوائے رنج کے کچھ نہ پایا۔ اے خیانت تجھ پر رحمت ہو' تیری وجہ سے میں نے خزانہ حاصل کیا!!

ہے کہ کیا یہ مسرت اخلاقیات کی مستقل اور مستحکم اساس بن سکتی ہے؟ جب کہ سوال ہوگا کہ مسرت کس کی؟ ہوسکتا ہے ایک آدمی کی مسرت دوسرے آدمی کی مسرت سے ٹکرا رہی ہو۔ اسی طرح مسرت اور تلذذ (sensual gratification) میں بڑا باریک سا پردہ رہ جاتا ہے۔ وہ جو کہا گیا ہے ؏ ''مردی و نامردی قدمے فاصلہ دارد'' (ہمت اور بے ہمتی میں ایک قدم کا فاصلہ ہے)۔ جس طرح فکر' سوچ اور روحانی مسرت کا یقیناً اخلاق کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے اسی طرح دنیا جانتی ہے کہ بہت سے لوگ ہیں جن کی شخصیتیں مسخ ہو جاتی ہیں' انہیں دوسروں کو اذیت پہنچا کر مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اذیت پسند لوگ (sadist) دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مسرت اعلیٰ اخلاق کی کوئی بنیاد نہیں بن سکتی' کیونکہ یہ کوئی پائیدار قوتِ محرکہ نہیں ہے۔

(ب) <u>نظریۂ منفعت</u>: ایک دوسرا فلسفہ ہے ''منفعت''۔ انگریزی کی مشہور کہاوت ہے: Honesty is the best Policy —— یقیناً جزوی اعتبار سے یہ بات درست بھی ہے۔ کاروبار میں اگر ایک شخص دیانت اور صداقت کا معاملہ کر رہا ہے تو اس کی ساکھ بن جائے گی' لوگ اس پر اعتماد کرنے لگیں گے' وہ ایک کامیاب تاجر ثابت ہوگا' اس کی صداقت و امانت دنیا میں بھی اس کے لیے نافع ہو جائے گی۔ جزوی اعتبار سے یہ بات صحیح ہے' لیکن اسی کو آگے بڑھایئے تو ایک کی منفعت دوسرے کی مضرت بھی بن جاتی ہے۔ ایک کا نفع دوسرے کے لیے نقصان بنتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ کوئی مستقل اصول نہیں ہے۔

(ج) <u>نظریۂ اجتماعی منفعت</u>: ایک اور تصور دنیا میں دیا گیا ہے ''اجتماعی منفعت'' کا کہ اگر کسی شخص کا تعلق کسی اجتماعیت سے ہے اور اس کے دل میں اس اجتماعیت کے لیے' مثلاً اپنی برادری (community)' اپنی قوم یا اپنے وطن کے لیے اگر سچی محبت کا جذبہ ہے تو یہ بھی اخلاق کی بنیاد بنتی ہے۔ میں یہاں بھی تسلیم کروں گا کہ جزوی طور پر یہ بات صحیح ہے کہ قوم پرست اور وطن پرست انسان اپنی قوم اور وطن کے لیے ایک اچھا انسان ہوگا' ان کو دھوکہ نہیں دے گا' ان سے فریب نہیں کرے گا۔ یہاں پر میرا ذہن منتقل ہوا ہے نبی اکرم ﷺ کے خطبات میں سے ایک بہت ہی ابتدائی دور کے خطبے کی جانب جسے ''نہج البلاغہ'' کے مرتبین نے بھی شامل کیا ہے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ نے اسی بنیاد کو ایک دلیل کے طور پر پیش فرمایا ہے۔

((اِنَّ الرَّائِدَ لَا یَکْذِبُ اَھْلَهٗ ' وَاللّٰهِ لَوْ کَذَبْتُ النَّاسَ جَمِیعًا مَا کَذَبْتُکُمْ ' وَلَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ مَا غَرَرْتُکُمْ ' وَاللّٰهِ الَّذِی لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ' اِنِّی لَرَسُوْلُ

اللّٰہِ اِلَیْکُمْ خَاصَّۃً وَّاِلَی النَّاسِ کَآفَّۃً ' وَاللّٰہِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ ' وَلَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ ' وَلَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ' وَلَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَّبِالسُّوْءِ سُوْءًا ' وَاِنَّھَا لَلْجَنَّۃُ اَبَدًا اَوِالنَّارُ اَبَدًا))(۱۲)

''بے شک راستہ دکھانے والا اپنے قافلے والوں کو دھوکہ نہیں دیتا۔ اور خدا کی قسم! اگر میں بالفرض تمام لوگوں سے جھوٹ بول سکتا تو بھی تم سے جھوٹ نہ بولتا' اور اگر بالفرض تمام نوعِ انسانی کو دھوکہ دے سکتا تو بھی تمہیں دھوکہ نہ دیتا۔ پس اللہ کی قسم' جس کے سوا کوئی معبود نہیں' بلاشبہ میں تمہاری جانب رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں خصوصیت کے ساتھ اور تمام نوعِ انسانی کی جانب عمومیت کے ساتھ۔ اللہ کی قسم' بلاشبہ تم سب مر جاؤ گے جیسے سو جاتے ہو' اور بلاشبہ تم سب اٹھائے جاؤ گے جیسے نیند سے بیدار ہوتے ہو۔ اور ضرور بالضرور تم سب سے حساب ہو کر رہے گا اُس کے بارے میں جو تم عمل کرتے رہے' اور ضرور تمہیں بدلہ دیا جائے گا نیکی کا اچھا بدلہ اور برائی کا برا بدلہ۔ وہ یا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت ہے یا ہمیشہ ہمیشہ کی آگ۔''

یہ ایک چھوٹا سا خطبہ ہے' لیکن بہت جامع ہے۔ میں اس کا حوالہ اس لیے دے رہا ہوں کہ آج دنیا میں ہمارے سامنے یہ بات ایک حقیقت کے طور پر موجود ہے۔ آپ انگلستان یا امریکہ جاتے ہیں وہاں وقت کی پابندی ہوتی ہے۔ کوئی شخص چین کا دورہ کر کے آتا ہے' وہ کہتا ہے کہ اصل اسلام تو وہاں ہے' لوگوں کے اخلاق و کردار' وہاں کا نظم و ضبط' لوگوں کا صاف معاملہ کرنا' دھوکہ نہ دینا' فریب سے کام نہ لینا۔ واقعہ یہ ہے کہ قوم پرستی' وطن پرستی (Nationalism) اور اس سے آگے بڑھ کر انسان دوستی (Humanism) ایک نظریے کے ساتھ وابستگی (Idealism)' یہ چیزیں یقیناً انسان کے اندر اخلاقِ حسنہ کی ترویج اور خارج میں تنفیذ کے لیے مفید ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن یہاں بھی یہ بات سامنے آئے گی کہ اس کی وسعت (scope) تو بہت محدود (limited) ہے۔ اس لیے کہ ہمارا مشاہدہ ہے اور پوری دنیا جانتی ہے کہ جو لوگ اپنی قوم کے لیے نہایت رحم دل' نہایت سچے' دھوکہ نہ دینے والے' کاروبار میں راست باز ہوتے ہیں یہی لوگ دوسری قوموں کا خون چوسنا روا سمجھتے ہیں۔ یہی مہذب قومیں جب بین الاقوامی سطح پر آتی ہیں تو ان سے بڑا جھوٹا' ان سے بڑا دھوکے باز' اُن سے بڑا ظالم اور کوئی نہیں ہوتا۔ یہ لوگ پوری پوری قوموں کو بیچ کھائیں گے ؎ ''قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند'' (پوری قوم کو بیچ

(۱۲) انساب الاشراف للبلاذری' دعاء رسول اللّٰہﷺ۔ فقہ السیرۃ للالبانی: ۹۷۔

دیا اور کس قدر سستا بیچ دیا!) ہندوستان میں ایک ایک شخص کے بدلے پوری پوری آبادیاں تہس نہس کر دی گئیں۔ ایک انگریز کے قتل کا انتقام لینے کے لیے پوری پوری بستیاں تباہ و برباد کر دی گئیں۔ نہ انہیں معاہدوں کی پرواہ ہوتی ہے نہ بین الاقوامی قراردادوں کی' وہ صرف اپنے مفادات کو دیکھتے ہیں۔ خاص طور پر انگریزوں نے عرب قوم سے جو وعدے کیے تھے اور انہیں جو فریب دیا تھا' جس کی وجہ سے عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی تھی' پہلی جنگِ عظیم کے دوران ان وعدوں کا کیا ہوا؟ وہ سارے وعدے ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گئے۔ تو یہ نظریہ بھی اخلاقیات کی ایک بنیاد تو ہے لیکن اس کی محدودیت (limitation) ظاہر و باہر ہے۔

اصل جذبہ محرکہ ''ایمان''

ایک ایسا جذبہ محرکہ' ایک ایسی motivation جو کہیں ناکام نہ ہو' ہر سطح پر انسان کو خیر اور بھلائی کے لیے کھڑا رکھے اور اس میں استقامت پیدا کرے' کہیں بھی جا کر اس کی صداقت اور امانت میں ضعف پیدا نہ ہو' اس کی مثال ہمارے سامنے آتی ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے شام کا ایک شہر فتح کیا تو وہاں کے لوگوں سے جزیہ وصول کر لیا' لیکن جنگی صورت حال ایسی ہوئی کہ انہیں پسپائی اختیار کرنی پڑی' محسوس ہو رہا تھا کہ دشمن ہمیں گھیرے میں لے رہا ہے۔ اس صورت حال میں انہوں نے شہر کے لوگوں کو بلا کر ان کی جزیے کی رقم واپس کر دی۔ یہ جو اخلاق کا مرتبہ ہے جس میں کسی سطح پر جا کر بھی پستی دکھائی نہیں دیتی' یہ درحقیقت صرف اور صرف ایمان کے ذریعے ممکن ہے۔ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ اصل میں وہ جذبہ محرکہ ہے جو قرآن ہمیں عطا فرماتا ہے۔

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ' دونوں میں مثبت اور منفی پہلو موجود ہیں۔ ایک طرف اللہ کی محبت' اللہ کی رضا جوئی اور دوسری طرف اللہ کا خوف' تقویٰ' یہ احساس کہ اللہ ہم سے ناراض نہ ہو جائے' درحقیقت ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ ہم تقویٰ کا ترجمہ صرف خوف سے کر دیتے ہیں تو اس میں ایک محدودیت آ جاتی ہے۔ اصل مثبت جذبہ محبت کا ہے۔ جیسے ایک سعادت مند بیٹا یہ محسوس کرتا ہے کہ میرے والد ناراض نہ ہو جائیں' کہیں میں اپنے والد کے احساسات کو ٹھیس نہ پہنچا دوں' ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے ان کی دل شکنی ہو' اس وجہ سے اگر وہ اپنے والد کی اطاعت کر رہا ہے اور جو چیزیں انہیں پسند ہیں ان کا اہتمام کر رہا ہے' تو یہ تقویٰ کی اصل حقیقت ہے۔

ایمان باللہ کی حقیقت یوں سمجھئے کہ انسان نے عُروۃُ الوُثقٰی (مضبوط کنڈا) تھام لیا۔ اب بڑے سے بڑے امتحان میں اس کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئے گی۔ دوسرا ایمان بالآخرۃ ہے۔ میں صرف وضاحت کے لیے عرض کر رہا ہوں کہ اس میں سلبی پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ یعنی آخرت کا خوف' آخرت کی جواب دہی کا احساس کہ ہر سانس کے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے۔ اس کے لیے انسان اگر شعور تازہ رکھے تو یقیناً وہ ہر قدم پر اپنا محاسبہ کرے گا کہ کہیں مجھ سے کوئی غلط حرکت تو نہیں سرزد ہوگئی اور ہوشیار رہے گا کہ کہیں مجھ سے کوئی غلط فعل نہ سرزد ہو جائے۔

ایمان بالآخرہ کے ضمن میں سورۃ العلق کی تین آیات کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام بھی غور و فکر کے مراحل سے گزرتے ہیں۔ جیسے وحی کے آغاز سے قبل نبی اکرم ﷺ کا غارِ حرا کا دور ہے۔ اس کے بارے میں شارحین نے وضاحت کی ہے کہ **کان صفۃ تعبّدہ فی غار حراء التفکّر والاعتبار**[۱۳] (غارِ حرا میں نبی اکرم ﷺ کی عبادت کی کیفیت تفکر و اعتبار پر مبنی تھی)۔ غور و فکر اور سوچ بچار ایک تو فلسفیانہ مسائل پر ہے اور ایک اپنے گرد و پیش کے حالات پر ہے۔ سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات کی حیثیت تو سب سے پہلی وحی کی ہے' لیکن اس کے بعد جو تین آیات آئی ہیں ان کے پس منظر میں نبی اکرم ﷺ کے غور و فکر کا جواب ملتا نظر آتا ہے کہ ایک حساس انسان جس کی اپنی اخلاقی حس انتہائی بیدار ہے' وہ معاشرے میں دیکھتا ہے کہ ظلم و تعدی ہے' حق تلفیاں ہو رہی ہیں' لوگوں پر جبر ہو رہا ہے' جھوٹ بولا جا رہا ہے' عزتیں اور حرمتیں پامال ہو رہی ہیں۔ خاص طور پر عرب کے اُس معاشرے کا تصور کریں کہ اخلاقی اعتبار سے وہ معاشرہ کس سطح پر پہنچا ہوا تھا' اس میں نبی اکرم ﷺ غور و فکر فرما رہے ہیں کہ اس ظلم کا ازالہ کیسے ہو؟ انسان طرح طرح کے دکھوں' مصائب اور رنج و آلام میں مبتلا ہے۔ اس سے نجات (salvation) کا کوئی راستہ ہے یا نہیں؟ اس طرح ان آیات کے پس منظر میں ایک گہرا فکر معلوم ہوتا ہے جس میں رہنمائی دی جا رہی ہے۔ جیسا کہ حضرت عزیر علیہ السلام نے بیت المقدس کو اس حالت میں دیکھ کر فرمایا تھا کہ ایک اینٹ سلامت نہیں

(۱۳) اس قول کا تلاش کے باوجود کوئی حوالہ دستیاب نہ ہو سکا۔ انبیاء علیہم السلام کے غور و فکر کے مراحل سے گزرنے کے حوالے سے مختلف آراء رہی ہیں۔ البتہ یہ بات سب کے ہاں مسلّم ہے کہ منصبِ نبوت وہبی تھا نہ کہ کسبی! (مرتب)

رہی' کوئی متنفس موجود نہیں' بستی اُجڑی ہوئی ہے۔

﴿اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (البقرۃ:۲۵۹)

''اللہ اس بستی کو اس تباہی کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟''

ایسے ہی اس معاشرے کا معاملہ تھا جو اخلاق کی انتہائی پستی تک پہنچ گیا تھا۔ اب یہ اس قعر مذلت سے کیسے نکلے گا؟ یہ فکر ہے' یہ سوچ ہے!

اس پس منظر میں ان تین آیات پر غور کیجیے' فرمایا: ﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى ۝﴾ ''نہیں! انسان سرکشی پر اتر آتا ہے''۔ دست درازی پر آمادہ ہو جاتا ہے' اپنے حدود سے متجاوز ہو جاتا ہے۔ آپ کا یہ مشاہدہ صحیح ہے' معاشرے میں ظلم ہے' حق تلفی ہے' ناانصافی ہے' جبر ہے' discrimination ہے' اعلیٰ اور ادنیٰ کی تقسیم ہے۔ پھر یہ کہ جھوٹ بولا جا رہا ہے' حق داروں کی حق تلفی کی جا رہی ہے۔ مشاہدہ تو یقیناً درست ہے۔ آگے فرمایا: ﴿اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝﴾ ''سبب یہ ہے کہ انسان دیکھتا ہے اپنے تئیں کہ مستغنی ہے''۔ کہیں پکڑ نہیں ہو رہی۔ اگر کوئی انگارا ہاتھ میں لیا جائے تو ہاتھ جل جاتا ہے' مگر جھوٹ بولا جائے تو کچھ نہیں ہوتا' زبان پر چھالا تک نہیں پڑتا۔ اگر زہر کھا لیا جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے' لیکن یتیم کا مال ہڑپ کر لیا جاتا ہے' حقداروں کا حق ہڑپ کر لیا جاتا ہے مگر کچھ نہیں ہوتا' پیٹ درد تک نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ ایک اعتبار سے تو یہ دنیا مکمل ہے کہ مادی قانون اپنے نتائج پیدا کر رہا ہے' لیکن اخلاقی قانون یہاں نتائج پیدا نہیں کر رہا بلکہ بسا اوقات غلط نتیجہ نکلتا ہے۔ حرام خوری کرنے والے عیش کر رہے ہیں' ظلم کرنے والے اقتدار کی مسندوں پر بیٹھے ہیں' جن لوگوں نے حقوق سے دوسروں کو محروم کیا وہی ہیں کہ جن کی چودھراہٹیں ہیں' انہیں معاشرے میں عزت مل رہی ہے۔ پھر فرمایا: ﴿اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝﴾ ''یقیناً تیرے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے''۔ اس کا علاج ایک ہی ہے کہ انسان کے سامنے یہ حقیقت موجود اور مستحضر رہے کہ اسے اس زندگی میں فوری پکڑا نہیں جا رہا' فوری سزا نہیں مل رہی' لیکن یہ جو اللہ کی طرف رجوع ہے ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ — تو وہاں اصل آخرت کا محاسبہ ہے' جواب طلبی ہے۔ یہ ہے اصل شے کہ اگر یہ یقین دل میں قائم ہو جائے تو پھر کیسا ظلم؟ کیسی تعدی؟ کیسی ناانصافی؟ کیسے کوئی جھوٹ بولے گا' کیسے کوئی فریب دے گا' اگر یہ احساس ہو کہ ایک ایک عمل' ایک ایک قول کی جواب دہی کرنی ہے!

واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے اخلاق واعمال کی درستی کے لیے ایک تو آخرت کی فکر کو' آخرت کے یقین کو' جواب دہی کے احساس (The Grand Accountibility) کو اور دوسرے اللہ تعالیٰ کی محبت کو بنیاد بنایا ہے۔ اور یہ محبت دوطرفہ ہے۔ اللہ بندوں سے محبت کرتا ہے اور بندوں سے چاہا گیا ہے کہ اللہ سے محبت کریں۔ یہ دوسرا پہلو میں بعد میں بیان کروں گا' پہلے یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جابجا اپنی محبت کا کس قدر ترغیب وتشویق کے انداز میں مثبت اور منفی پہلوؤں سے ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ (البقرۃ) ''بے شک اللہ احسان کی روش اختیار کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے''۔ احسان کا تذکرہ دونوں معنوں میں ہوتا ہے' ایک یہ کہ لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنا اور دوسرے یہ کہ ''احسان'' مراتبِ دینیہ میں سے ایک اعلیٰ مرتبہ بھی ہے جو کہ ہماری گفتگو کے دوسرے حصے یعنی ''اسلام کے روحانی نظام'' سے متعلق ہے۔ اسی طرح دیگر مقامات پر ہے:
﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ﴾(التوبۃ) ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَہِّرِیْنَ﴾(البقرۃ) ﴿وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ﴾ (آل عمران) ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ﴾(آل عمران) ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ﴾(الحجرات) یعنی اللہ کو محبوب ہیں جو تقویٰ کی روش اختیار کرنے والے ہیں' توبہ کرنے والے اور ہر طرح کی طہارت و پاکیزگی کا اہتمام کرنے والے ہیں' صبر کرنے والے ہیں' توکل کرنے والے ہیں' عدل وانصاف پر کاربند ہیں —— اور اس کی سب سے اونچی چوٹی یہ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّہُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾ (الصف)

''اللہ محبت کرتا ہے ان بندوں سے جو جنگ کرتے ہیں اس کی راہ میں ایسے کہ جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔''

اس میں درحقیقت سب سے بڑی تحریض اور motivation ہے کہ یہ وہ چیز ہے جو کہیں بھی جا کر ختم نہیں ہوگی' کبھی بھی انسان کا ساتھ نہیں چھوڑے گی' ہر لحظہ' ہر لمحہ' ہر منزل' ہر مرحلے پر یہ انسان کے ساتھ رہے گی۔ یہ ہے اللہ کی محبت اور اللہ کی رضاجوئی کا جذبہ اور محاسبۂ اخروی کا احساس۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَہَی النَّفْسَ عَنِ الْہَوٰی ۝ فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ہِیَ

الْمَاْوٰى ﴿٤١﴾ (النّٰزِعٰت)

''اور جو شخص (دنیا میں) اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا' تو یقیناً جنت اُس کا ٹھکانا ہوگی۔''

یہ ہے وہ ایمان کا جذبۂ محرکہ جو قرآن اور سنتِ رسول ﷺ ہمیں فراہم کرتے ہیں۔ باقی جہاں تک بنیادی انسانی اخلاقیات کا تعلق ہے ان کے ضمن میں قرآن مجید نے خود ہمیں یہ ہدایات دی ہیں کہ وہ سب انسانوں کے نزدیک جانی پہچانی حقیقتیں ہیں اور ان کے لیے انسان کسی تعلیم کا محتاج نہیں۔ ان دو باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارے لیے سیرت و کردار کی تعمیر اور تہذیب اخلاق کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ ایمان کی گہرائی اور گیرائی کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے' قلب میں ان کے تخم کی آبیاری ہو اور اس کی افزائش کا اہتمام کیا جائے' اس میں اضافے کی کوشش کی جائے۔ اسی کا نام درحقیقت معرفت ہے۔ سورۃ الذاریات میں فرمایا:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾﴾

''اور نہیں پیدا کیا میں نے جنوں اور انسانوں کو مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

بہت سے حضرات نے اس کی جو تعبیر کی ہے وہ یہ ہے کہ اِلَّا لِيَعْرِفُوْنِ[14] (مگر اس لیے کہ وہ میری معرفت حاصل کریں) اگر اللہ کی معرفت حاصل ہوگی' اللہ کی ہستی کا یقین ہوگا' اللہ سے ملاقات کا یقین اور امید ہوگی تو انسان کے اخلاق میں عظیم تبدیلی رونما ہو جائے گی۔ قرآن مجید اس حقیقت کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے۔ سورۃ الفرقان میں ارشاد ہوا ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿٢١﴾﴾

''اور کہتے ہیں وہ لوگ جو ہم سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے' کیوں نہیں آتے ہمارے پاس فرشتے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیں؟ تحقیق یہ لوگ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں اور یہ لوگ حد (انسانیت) سے بہت دُور نکل گئے ہیں۔''

جب اللہ سے ملاقات کی امید نہیں رہی تو اب نیکی کی اساس کہاں رہی؟ نیکی کا اگر شعور بھی ہے تو اس پر کاربند ہونے کا جذبہ کہاں سے لائیں گے؟ ہاں اللہ کی معرفت' اللہ کی محبت' اللہ کا شوقِ لِقاء' اللہ کے حضور میں حاضری اور اس کے سامنے جوابدہی کا خوف اور اللہ کی محبت سے سرشار ہو کر اس سے ملاقات کا اشتیاق اگر موجود ہے تو یہ ہے وہ چیز کہ بڑے سے بڑا نقصان ہو جائے

(۱۴) امام تفسیر' حضرت مجاہدؒ سے یہ تفسیر منقول ہے۔ تفسیر بحر المحیط لابی حیان' سورۃ الذاریات۔

لیکن انسان سچ پر' صداقت پر' امانت پر کار بند رہے گا۔ بڑی سے بڑی تکلیف آ جائے' انسان اس سے کسی جھوٹ کے ذریعے بچنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

اس ضمن میں آخری بات یہ عرض کروں گا کہ ایمان کو تر و تازہ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نماز جیسی عظیم ترین عبادت عطا فرمائی ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ۝۱۴﴾ (طٰہٰ) ''اور قائم رکھو نماز کو میری یاد کے لیے''۔ اور یہ بھی نوٹ کیجیے' سورۂ طٰہٰ میں یہ بات پہلے تو مثبت انداز میں آئی۔ اسی سلسلۂ خطاب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو چل رہی ہے' انہوں نے عرض کیا: ''پروردگار! میرا سینہ کھول دے' اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے' اور میری زبان کی گرہ بھی کھول دے' تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔ نیز میرے گھر والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا ساتھی بنا دے......'' جب یہ درخواست منظور ہو گئی تو پھر دوبارہ حکم دیا گیا: ﴿وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ۝۴۲﴾ (طٰہٰ) ''دیکھنا میری یاد میں تساہل سے کام نہ لینا''۔ ﴿اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى۝۴۳﴾ (طٰہٰ) ''جاؤ تم دونوں فرعون کی طرف' وہ سرکشی پر اُتر آیا ہے۔'' اقامتِ صلوٰۃ کا حکم اسی لیے دیا گیا ہے تاکہ ایمان کا شعور بیدار ہوتا رہے۔ اس پر جو ماحول کے اثرات پڑتے رہتے ہیں وہ صاف ہوتے رہیں۔ جیسے اگر کہیں برفباری ہو رہی ہو تو بار بار ضرورت پڑتی ہے کہ جو بھی برف کے گالے پڑے ہیں ان کو صاف کیا جائے۔ اسی طرح سے انسان پر جو ماحول کے اثرات مرتب ہوتے ہیں' جو حجابات طاری ہوتے ہیں' ان کو دور کرنے کے لیے نماز کا حکم دیا گیا۔ اس کے ساتھ جو دوسری عبادات ہیں ان کا تذکرہ دوسرے نمبر پر کروں گا' لیکن یہاں پر نماز کا تذکرہ اس اعتبار سے ہو گیا کہ ایمان ہی ہماری اصل قوتِ محرکہ (motivating force) ہے اور اس کی آبیاری کو مستحکم رکھنے کا بہترین طریقہ نماز ہے۔ اس حوالے سے مجھے حفیظ جالندھری کا یہ شعر بہت پسند ہے: ؎

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی

آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں!

ہمارا جو نفسِ عبدیت ہے یہ ماحول کے اثرات سے کچھ غبار آلود ہو جاتا ہے' اس کے اندر استکبار اور سرکشی کے جذبات سر اٹھاتے ہیں' جن کی اصلاح کے لیے نماز بہترین عمل ہے۔ یہ گویا تجدیدِ ایمان کا ایک ذریعہ ہے۔

اب میں اپنے موضوع کے دوسرے حصے کی طرف آ رہا ہوں اور وہ ہے'' اسلام کا روحانی نظام''۔

—— حصہ دوم ——

اسلام کا روحانی نظام

''اسلام کا اخلاقی نظام'' اور'' اسلام کا روحانی نظام'' کے ضمن میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ ایک ہی مضمون کی دو سطحیں (levels) ہیں۔ مؤخر الذکر کو چاہے بلند تر کہہ لیں چاہے عمیق تر کہہ لیں' یہ دونوں باتیں لازم وملزوم ہیں۔ جو عمارت جتنی بلند آپ کو اٹھانی ہے اس کی بنیاد اتنی ہی گہری کرنی ہوگی۔ ایک ہی منزل کی عمارت ہے تو اتنی گہرائی کی ضرورت نہیں' دو منزلیں اٹھانی ہیں تو بنیاد اور گہری کرنی ہوگی اور کثیر المنزلہ عمارت اٹھانی ہے تو اس کے لیے اور گہری بنیاد دلے جانی ہوگی۔ یوں سمجھئے کہ اخلاق کا معاملہ ایک ابتدائی درجہ ہے لیکن روحانیت' روحانی تعلیمات اور اس کی فکری اساسات ایک عمیق تر درجہ کی غمازی کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ بلندی بھی لیے ہوئے ہیں۔ یہ اس دور کی بہت بڑی محرومی ہے کہ بعض اسباب کی بنا پر یہ موضوع بہت بدنام ہو چکا ہے' لوگوں کے ذہنوں میں اس سے بہت بُعد پیدا ہو چکا ہے اور حجابات طاری ہو چکے ہیں۔ لفظِ تصوف بعض حلقوں میں تو گالی بن کر رہ گیا ہے۔ بعض اچھے بھلے دینی حلقے بھی اس سے مناسبت نہیں رکھتے۔ زیادہ قابل افسوس بات یہ ہے کہ جو لوگ مذہبی اعتبار سے فعال ہیں' کچھ کام کر رہے ہیں' اپنی سمجھ اور اپنی سوچ کے مطابق دینی خدمتوں میں لگے ہوئے ہیں' بعض اسباب سے ان کے ہاں تصوف پر مغائرت کا پردہ حائل ہو چکا ہے اور نہ صرف اہمیت کی نفی ہے بلکہ شدت سے انکار ہے۔ اور بعض حضرات تو تصوف کو دین کی تعلیمات کے منافی قرار دے رہے ہیں۔ اس کے دو اسباب ہیں۔

پہلا سبب جو وسیع تر ہے اس کی جہتیں (dimensions) آفاقی (Universal) ہیں

اور اس نے پورے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ ایک مادی فکر (materialistic thought) ہے جو اس وقت چھا گیا ہے۔ یوں سمجھئے جیسے فضا میں معلق گرد و غبار (dust suspension) ہو تو پھر ہر شخص مجبور ہوتا ہے کہ وہ اسے inhale کرے۔ جب وہ سانس لے گا تو گرد لامحالہ اس کے پھیپھڑوں میں جائے گی۔ اسی طرح ہماری فضا کے اندر مادہ پرستی' مادی اخلاق' مادی سوچ' مادی اقدار ماحول کے اندر اس طرح موجود ہیں کہ ہمارے وجود میں' کسی کے کم کسی کے زیادہ' سرایت کر گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ روح کے کسی جداگانہ تشخص کا سرے سے انکار ہے اور عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ روح اور جان (life and spirit) گویا دو ہم معنی الفاظ ہیں۔ روح کا کوئی جداگانہ اور آزادانہ (independent) تشخص بھی ہے —— اس کا بہت کم لوگ اقرار کرتے ہیں۔

مغربی فکر کے غلبہ اور استیلاء کے ساتھ ساتھ تصوف سے بُعد کا دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ روحانیت اور روحانی تعلیمات کے لیے جو لفظ بطور عنوان اختیار کر لیا گیا یعنی ''تصوف'' یہ درحقیقت ایسا ہی ہے جیسے کبھی مشرقی پاکستان میں ''باہری'' کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا' یعنی باہر سے آئے ہوئے لوگ۔ تصوف باہری اصطلاح ہے' یہ قرآن کی اصطلاح نہیں ہے۔ پھر ایک اعتبار سے مجہول النسب ہے' یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا مادہ کیا ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ چونکہ صوفیہ اپنے آپ کو مشقت میں ڈالنے کے لیے اُون کے کپڑے پہنتے تھے' لہٰذا یہ لفظ 'صوف' سے بنا ہے۔ بعض نے اسے 'صفا' سے مشتق قرار دینے کی کوشش کی ہے' لیکن کوئی محقق یقینی بات نہیں کہہ سکا۔ زیادہ تر اس خیال کا اظہار کیا جاتا ہے کہ یہ یونانی اصطلاح Theosophy سے بنا ہے۔ یونانی فلسفے کے زیر اثر یہ لفظ وہاں سے آیا ہے جس نے تصوف کی شکل اختیار کر لی —— واللہ اعلم۔ پھر رفتہ رفتہ یہ لفظِ تصوف نہ صرف دین کی اصل اصطلاح ''احسان'' کا قائم مقام بن گیا' بلکہ اس نے ''احسان'' کو بالکل ناک آؤٹ کر دیا۔ قرآن و حدیث کی اصل اصطلاح احسان ہے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ ''اور اللہ احسان کی روش اختیار کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔''

تصوف یا احسان؟

حدیثِ جبریلؑ میں درحقیقت ہماری مذہبی زندگی کے تین درجات (levels) کو معین کیا گیا ہے۔ پہلا درجہ اسلام ہے' اس سے اونچا درجہ ایمان اور اس سے اونچا درجہ احسان

ہے۔ حدیثِ جبریل کو ''اُمّ السنۃ'' قرار دیا گیا ہے اور یہ حدیث کی مختلف کتابوں میں مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔ یہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور صحیح مسلم میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے الفاظ کے فرق کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔ صحیح بخاری کی روایت ملاحظہ فرمایئے:

عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ ﷺ قَالَ : کَانَ النَّبِیُّ ﷺ بَارِزًا یَوْمًا لِلنَّاسِ، فَاَتَاهُ جِبْرِیْلُ، فَقَالَ: مَا الْاِیْمَانُ؟ قَالَ: ((اَلْاِیْمَانُ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَآئِکَتِهٖ وَبِلِقَائِهٖ وَرُسُلِهٖ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ))، قَالَ :مَا الْاِسْلَامُ ؟ قَالَ :((اَلْاِسْلَامُ أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِکَ بِهٖ شَیْئًا ، وَتُقِیمَ الصَّلَاةَ ، وَتُؤَدِّیَ الزَّکَاةَ الْمَفْرُوْضَةَ، وَتَصُومَ رَمَضَانَ)) ، قَالَ :مَا الْاِحْسَانُ؟ قَالَ :((أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ، فَاِنْ لَمْ تَکُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاکَ......))(۱)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ایک دن نبی مکرم ﷺ لوگوں میں بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور پوچھنے لگے: ایمان کسے کہتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''ایمان یہ ہے کہ تو اللہ اور اس کے فرشتوں کا اور اس سے ملنے کا اور اس کے پیغمبروں کا یقین کرے اور مر کر جی اٹھنے کو مانے''۔ انہوں نے پوچھا کہ اسلام کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسلام یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے، اور نماز کو قائم کرے، اور زکوٰۃ ادا کرے اور رمضان کے روزے رکھے''۔ اُس نے پوچھا کہ احسان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی ایسی عبادت کرے جیسے کہ تو اُسے دیکھ رہا ہے، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو وہ تو تجھے دیکھ ہی رہا ہے......''

قرآن حکیم میں سورۃ المائدۃ کی آیت ۹۳ بعض اعتبارات سے مشکل بھی ہے اور بہت کم حضرات نے اس کے مضمرات پر توجہ کی ہے۔ شراب کی حرمت کی جب آخری آیت نازل ہوگئی تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں تشویش پیدا ہوئی کہ اب تک ہم پیتے رہے، یہ چیز اگر نجس ہے، مضر ہے، تو اس کے اثرات تو ہمارے وجود میں شامل ہو چکے ہیں۔ اسی طرح جو حضرات حرمت کے آخری یا حتمی حکم کے آنے سے پہلے فوت ہو چکے ان کا کیا ہوگا؟ اور جو اس دوران فوت ہوگئے ان کو توبہ کا موقع نہیں ملا، ان کا کیا ہوگا؟ (یہی تشویش تحویل قبلہ کے موقع پر ہوئی تھی کہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبریل النبی ﷺ

ہماری سولہ مہینے کی نمازیں کس حساب میں درج ہوں گی؟ وہ تو قبلہ نہیں تھا' قبلہ تو اصل یہ بیت اللہ تھا' تو ہماری سولہ مہینے کی نمازیں کیا ضائع ہو جائیں گی؟) جس طرح وہاں تسلی کرائی گئی تھی اسی طرح اس معاملے میں قرآن حکیم میں اہل ایمان کی تسلی کرائی گئی:

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (المائدۃ)

''جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اُن پر کچھ گناہ نہیں اُس میں جو وہ پہلے کھا پی چکے' جب کہ انہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی اور ایمان لائے اور نیک اعمال کیے' پھر تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے' پھر تقویٰ اختیار کیا اور درجۂ احسان پر عمل کیا۔ اللہ دوست رکھتا ہے ایسے محسنین کو۔''

تحویل قبلہ کے حوالہ سے فرمایا گیا تھا:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (البقرۃ)

''اور اللہ ایسا نہیں کہ ضائع کر دے تمہارا ایمان (نماز)' بے شک اللہ لوگوں پر بڑی شفقت رکھنے والا اور مہربان ہے۔''

جب اُس جانب رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم تھا تو رخ اُس طرف کر لیا' اور اب اِس جانب کا حکم ہے' چنانچہ اِدھر رُخ کر کے نمازیں ادا کی جائیں گی۔ اسی طرح جب شراب کی حرمت کا آخری حکم آ گیا تو اس تشویش کو رفع کرنے کے لیے یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی۔ اس میں واضح کر دیا گیا کہ وہ لوگ جو ایمان کے عملی تقاضوں کو پورا کرتے رہے' نیک کام کرتے رہے' ان پر کوئی حرج نہیں ہے جو کچھ بھی وہ پہلے کھا پی گئے۔ کسی شے کے آخری حکم کے نزول سے پہلے جو بھی ان کا عمل رہا ہے' جو چیزیں استعمال کی ہیں' ان پر کوئی الزام نہیں۔ اس آیت میں تقویٰ کے تین درجے بیان ہوئے ہیں۔ تقویٰ گویا اس میں moving force یعنی آگے بڑھانے والی قوت ہے' جو انسان کو نیکی پر ابھارتی ہے۔ تقویٰ نے ان کے ایمان اور عمل صالح میں ایک خاص رنگ پیدا کر دیا۔ پھر ان میں مزید تقویٰ پیدا ہوا تو ان کا ایمان اس قانونی ایمان سے بڑھ کر یقین قلبی پر مبنی حقیقی ایمان بن گیا۔ پھر ان کے تقویٰ نے ان کو اگلے مرحلہ تک پہنچایا جو مرحلۂ احسان ہے۔ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ...... اور احسان کا درجہ تو محبوبیتِ خداوندی کا مقام ہے۔

تصوف کے لفظ نے ''احسان'' کی اصطلاح کو ہمارے دینی لٹریچر سے بالکل خارج کر دیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی ؒ کی کتاب کا عنوان ہے ''مقالاتِ احسانی''۔ لیکن عام آدمی احسان کے اصل معنی جانتا ہی نہیں۔ اچھے بھلے پڑھے لکھے لوگوں کو معلوم نہیں کہ احسان کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ لوگوں کے ساتھ نیکی کا معاملہ کرنا چاہیے۔ بس یہ تصور سامنے ہے۔ جیسے ایک قاعدہ ہے کہ جہاں کوئی بدعت آئے گی سنت وہاں سے رخصت ہو جائے گی' بدعت کسی نہ کسی جگہ سے سنت کو displace کر کے اپنی جگہ بناتی ہے' اسی طرح تصوف کی اصطلاح اس طرح چھا گئی کہ اس نے ہمارے شعور' ہماری فکر اور ہماری زبانوں سے لفظ احسان کو خارج کر دیا۔

مزید برآں بعض چوٹی کے فلسفیانہ مباحث' جیسے ماہیتِ وجود' ماہیتِ زمان وغیرہ' جو مابعد الطبیعیات (Mataphysics) کے مشکل مسائل ہیں' صوفیاء کے ہاں زیر بحث رہے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے جو بڑے صوفیاء گزرے ہیں جو تصوف کے امام تھے' وہی بہت بڑے فلسفی بھی تھے۔ اس دور کے ایک بہت بڑے مصنف اور مؤلف جو کہ تصوف کے شدید مخالف ہیں' ایک مرتبہ میری ان سے گفتگو ہو رہی تھی تو انہوں نے تسلیم کیا کہ اسلام کے اصل فلسفی صوفیاء ہی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ فلسفہ بلند ترین منزل پر انہی صوفیاء کرام کے ہاں نظر آتا ہے۔ چنانچہ بدقسمتی سے بعض فلسفیانہ مباحث بھی تصوف کا جزوِ لازم بن گئے ہیں۔ جیسے وحدت الوجود اور وحدت الشہود درحقیقت ایک فلسفہ ہے اور اس کا اصل میں ''احسان'' سے کوئی تعلق نہیں' لیکن چونکہ فلاسفہ اور حکماء وہی صوفیاء ہیں لہٰذا یہ خلط مبحث پیدا ہوا۔ چنانچہ جن لوگوں کو فلسفہ کے پیچیدہ اور عمیق مباحث سے ذہنی مناسبت نہیں ہے انہوں نے فلسفہ اور تصوف کو گڈمڈ کر کے دونوں کا انکار کر دیا۔

یہ مختلف اسباب ہیں جن کی بنا پر اسلام کی روحانی تعلیمات کا ایک عرض (dimension) ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ چونکہ اس دور میں فضا سائنسی عقلیت پسندی کی ہے کہ جو شے دیکھی جا سکتی ہو' محسوس کی جا سکتی ہو' چھوئی جا سکتی ہو' جو ہمارے حواس کی گرفت میں آ سکتی ہو' جس کی ہم توثیق کر سکتے ہوں کہ ایسا ہوا ہے یا نہیں' جو ہمارے تجرباتی دائرے کے اندر آ رہی ہو' بس توجہ اور دلچسپی اور بحث و تمحیص اسی کے بارے میں ہوتی ہے' لہٰذا ان تمام اسباب نے مل جل کر یہ نتیجہ نکالا کہ دین کی تعلیم کا یہ اہم ترین شعبہ جو بعض اعتبارات سے اصل لبِ لباب اور اصل مقصود قرار دیا جا سکتا ہے' اس دور میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو رہا ہے۔

دین کی روحانی تعلیمات اور احیائی تحریکیں

اس دور میں جو احیائی تحریکیں پے درپے ناکامیوں سے دوچار ہو رہی ہیں' میرے نزدیک اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ایمان کی وہ منزل یا ایمان کا وہ درجہ جس میں ایمان یقین کو پہنچ جائے' وہ ایک burning faith اور ایک living faith کی شکل اختیار کر لے اور اس کی حرارت انسان کو اپنے باطن میں محسوس ہو' یہ کیفیت نہیں ہے۔ بلکہ کچھ قیل و قال' کچھ فلسفیانہ و متکلمانہ گفتگو اور کچھ دلیل واستدلال سے کوئی بات ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں کچھ آگے چلتے بھی ہیں تو تھوڑی دیر میں ہمت جواب دے جاتی ہے۔ وہ استقامت جو محبتِ خداوندی سے پیدا ہوتی ہے' غیر موجود ہے۔ اگر پاؤں وہاں جمے ہوئے نہیں ہیں تو استقامت ممکن نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴿۳۰﴾﴾ (حٰم السجدۃ)

''بلاشبہ جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے' پھر اس پر جم گئے ایسے لوگوں پر فرشتے نازل ہوتے ہیں (اس بشارت کے ساتھ) کہ نہ خوف کرو اور نہ غمگین ہو اور جنت کی بشارت پاؤ جس کا کہ تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔''

اگر یہ استقامت نہ ہوگی تو دائیں بائیں سے کسی راہِ یسیر (short cut) کی تلاش ہوگی اور فوری نتیجہ برآمد کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ جو احیائی تحریکیں پے بہ پے ناکامیوں سے دوچار ہو رہی ہیں اس کا جب آپ گہرائی میں تجزیہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ مسئلہ وہی ہے جو میں عرض کر چکا ہوں۔ انسان کی حقیقت کو اگر نہیں سمجھا جیسا کہ قرآن میں بیان ہوئی ہے تو اسلام کے روحانی نظام کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اگرچہ وہ بطرزِ جلی بیان نہیں ہوئی' لیکن وہ لوگ جو اشارات سمجھنے کی استعداد رکھتے ہیں انہوں نے اسے سمجھا ہے اور بیان کیا ہے۔ انسان کا وجود مرکب وجود ہے' ایک اس کا حیوانی وجود ہے جو اس کے جسد خاکی اور اس کی جان کا مجموعہ ہے' جبکہ ایک اس کا روحانی وجود ہے جو اس کی روح پر مشتمل ہے۔ دونوں کا علیحدہ آزاد (independent) تشخص ہے' دونوں اپنے اپنے تقاضے رکھتے ہیں اور یہ تقاضے بہت حد تک ایک دوسرے سے متصادم اور متضاد ہیں۔ دونوں کے رجحانات میں بُعد المشرقین ہے' ایک اِدھر کھینچتا ہے تو دوسرا اُدھر کھینچتا ہے۔ ایک کا رُخ پستی کی طرف ہے تو دوسرے کا رُخ

بلندی کی طرف ہے۔ ایک کا مبدأ (origin) ہی بلندی ہے اور دوسرا وہ ہے کہ جس کا وجود خاک سے قائم ہوا ہے۔ اس اعتبار سے اگر اس حقیقت کو نہیں جانا جائے گا تو روحانی تعلیمات اور روحانی نظام کا سمجھنا قطعاً محال اور ناممکن ہے۔

یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ صرف نبی کی تعلیمات کامل ہوتی ہیں' باقی جو بھی دین کے مصلحین' مفکرین اور اصحابِ علم ہیں ان کا علم و فکر درجہ بہ درجہ ترقی کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾ (الانشقاق) ''تم لازماً سیڑھی بہ سیڑھی چڑھو گے''۔ چنانچہ ہمارے ہاں بھی اسلامی مفکرین سے ایک خطا ہوئی۔ یہ بات تو واضح رہی کہ ایک اسلامی ریاست ایک ٹھیٹھ اسلامی تحریک کے نتیجے میں قائم ہو سکتی ہے' لیکن اس بات کا شعور کہ اس اسلامی تحریک کے افرادِ کار کے اندر ایمان کی ایک خاص گہرائی اور گیرائی درکار ہے' اس نقطہ کے حوالے سے کوتاہی محسوس ہوتی ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں اسلام ایک موروثی عقیدہ ہے' ہم پیدائشی طور پر مسلمان ہیں مگر ایمانِ حقیقی کی وہ صورت کہ ہر شے میں اللہ ہی فاعلِ حقیقی نظر آئے' شاذ ہے۔ اکبرالٰہ آبادی نے کہا تھا ؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر تعمیر نہ کر بنیاد نہ رکھ!

چنانچہ ایمان کی بنیادیں مستحکم کیجیے۔ ایک زندہ یقین جو تحریک اسلامی کے کارکنوں کے وجود میں سرایت کیے ہوئے ہو ایسا ایمان درکار ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان کی شدت (intensity) ایمان بالشہود کی مانند تھی' جیسا کہ حدیث میں ایک صحابی کا قول آتا ہے: ((وَكَاَنِّي اَنْظُرُ اِلَى اَهْلِ الْجَنَّةِ ...... وَكَاَنِّي اَسْمَعُ عُوَاءَ اَهْلِ النَّارِ))(۱) ''گویا میں اہل جنت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں' اور گویا میں جہنمیوں کی چیخ و پکار سن رہا ہوں''۔ جب تک یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی اور اسلامی تحریک کے کارکنوں کی معتدبہ تعداد کی تربیت اس انداز میں نہیں ہوتی بظاہر احوال کامیابی کا کوئی تصور ممکن نہیں۔

یہاں میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے چند جملے نقل کر رہا ہوں جو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ریڈیو پاکستان پر نشر ہونے والی تقاریر سے ماخوذ ہیں:

''فلسفہ و مذہب کی دنیا میں عام طور پر جو تخیل کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ روح اور جسم ایک دوسرے کی ضد ہیں' دونوں کا عالم جدا ہے' دونوں کے تقاضے الگ ہیں بلکہ باہم مخالف

(۱) الایمان لابن ابی شیبۃ' کیف اصبحت یا حارث بن مالک؟ 'قال : اصبحت مؤمنا......

ہیں..... اسلام کا نقطۂ نظر اس معاملے میں دنیا کے تمام مذہبی اور فلسفیانہ نظاموں سے مختلف ہے.....''

ان جملوں کے بعد مولانا مرحوم نے اس نقطۂ نظر کی پُرزور نفی کی ہے اور اس ثنویت کا انکار کیا ہے۔ میرے نزدیک یہی وہ فکر کی کوتاہی ہے جس کی بنا پر اسلام کی روحانی تعلیمات اور اس کے روحانی نظام سے نگاہیں بالکل محجوب ہو کر رہ جاتی ہیں۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف مولانا مودودیؒ کا جملہ نہیں ہے بلکہ ایک خاص دور کے طرزِ فکر کا عکاس ہے۔ مولانا اصلاحی صاحب تو تصوف کے شدید مخالف ہیں۔ ان کے الفاظ تو یہ ہیں کہ ''میں تصوف کو سراسر ضلالت سمجھتا ہوں''۔ اس سے آگے کی بات آپ کو سرسید احمد خان' ان کے متبعین' پھر غلام احمد پرویز اور علامہ مشرقی کے ہاں مل جائے گی۔ یہ تمام وہ مکاتبِ فکر ہیں جنہوں نے دین پر بطور ''نظامِ زندگی'' غور و فکر کیا ہے اور غلطیوں اور کوتاہیوں سے دوچار ہوئے ہیں۔ کم از کم مولانا مودودیؒ کے بارے میں مَیں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ بحیثیت مجموعی ان کا مطالعہ بہت درست ہے' خصوصیت کے ساتھ اسلام کے کامل نظامِ حیات ہونے کے حوالے سے میری دیانت دارانہ رائے ہے کہ انہوں نے سیاسی اور معاشرتی نظام میں بہت صحیح تعبیر کی ہے اور اس کی بہت عمدہ تشریح و توضیح کی ہے۔ لیکن اصل کمی رہ گئی ہے دین کے باطنی پہلو کے حوالے سے جو دین کے ثمرات ہیں' جس کے لیے ہم ''روحانی نظام'' کا لفظ استعمال کر رہے ہیں۔ اس سے بُعد ہے' دوری ہے اور بعض حالات میں اس کا انکار ہے۔

انسان ایک مرکب وجود ہے

اس کے برعکس اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان کا وجود ایک مرکب وجود ہے۔ اس کا ایک وجود' جسد خاکی' مٹی سے بنا ہے۔ اس کی تخلیق کا طریق کار کچھ بھی ہو یہ ایک الگ بحث ہے۔ اور اس کے اندر ایک روح ہے' جس کا تعلق اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے قرار دیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ (الحجر:۲۹) ''اور جب میں پھونک دوں اس میں اپنی روح میں سے''۔ یہی مضمون انہی الفاظ کے ساتھ سورۂ ص (آیت ۷۲) میں بھی آیا ہے۔ اس کی ہم تفصیلی توجیہہ نہیں کر سکتے کہ اس کا مفہوم کیا ہے' لیکن بہر حال اس کا possesive mode ہے۔ انسان اور اس کے خالق کے مابین جو محبت ہے اُس کا ایک رخ ہے اللہ کا محبت کرنا بندوں کے ساتھ' اور دوسرا رُخ ہے انسان کا محبت کرنا اللہ کے ساتھ۔ یہ دوسرا رخ اس روحانی نظام کا

اصل موضوع ہے۔ ہمارے وجود کے چونکہ دو پہلو ہیں' لہٰذا ہمارے اندر محبتیں بھی دو ہیں۔ ایک محبت ہے ''حب الشہوات'' جیسا کہ سورۂ آل عمران میں فرمادیا گیا:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴾

''لوگوں کے لیے شہوانی خواہشات' عورتیں' بیٹے' سونے چاندی کے ڈھیر' نشان زدہ گھوڑے' مویشی اور کھیتی مزین کردیے گئے ہیں۔ یہ سب کچھ دنیا کی زندگی کا سامان ہے' جبکہ حقیقت میں جو ٹھکانہ بہتر ہے وہ اللہ کے پاس ہے۔''

ان تمام چیزوں کی محبت انسان کے اندر موجود ہے اور یہ اس کے لیے مزین کردی گئی ہیں۔ لیکن یہ ہمارے کون سے جُزو کا حصہ ہیں؟ یہ ہمارے اس حیوانی وجود کی محبت ہے۔ یہ اس وجود کے تقاضے اور اس کے تسلسل کے ذرائع ہیں۔ اگر یہ محبت نہ ہو تو یہ دنیا کا ہنگامہ' یہاں کی رونقیں ختم ہو کر رہ جائیں۔ یہ محبتیں بڑی قوی ہیں' بڑی شدید ہیں' ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ﴾ (العادیات) اس کی وجہ سے ساری تمدن کی رونق ہے' گہما گہمی ہے' بھاگ دوڑ ہے۔ یہ سارا معاملہ ان محبتوں پر قائم ہے۔ جہاں تک ہماری روح اور ہمارے روحانی وجود کا تعلق ہے اس کے اندر بھی ایک محبت ہے' لیکن وہ محبت دبی ہوئی ہے' اس کا ہمیں شعور نہیں ہے' اسے ہم بھلائے بیٹھے ہیں۔ آیت مبارکہ ہے:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ (الحشر)

''ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے ان کو اپنے آپ سے غافل کردیا۔ یہی لوگ ہیں جو نافرمان ہیں۔''

اپنے آپ سے غافل ہونا اپنے اس روحانی وجود سے غافل ہونا ہے جو اصل انسان ہے' جس کی بنا پر یہ شرف حاصل ہوا کہ انسان مسجودِ ملائک بنا' اسے خلافت میسر آئی' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴾ (بنی اسراءیل)

''اور ہم نے عزت دی آدم کی اولاد کو اور سواری دی ان کو جنگل اور دریا میں اور روزی

دی ہم نے ان کو ستھری چیزوں سے اور بڑھا دیا ان کو بہتوں سے جن کو پیدا کیا ہم نے بڑائی دے کر۔"

اس اصل وجود کی جانب سے ذہول ہے اور آج کا جدید فکر اس وجود کا انکار کر رہا ہے۔ ہمارے روحانی وجود کی بھی ایک محبت ہے' لیکن یہ محبت اللہ کی محبت سے عبارت ہے۔ اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص تعلق و ربط ہے جسے ہم سمجھ نہیں سکتے۔ مولانا رومیؒ نے بڑے پیارے انداز میں ایک شعر میں کہا ہے ۔

اتصالے بے تکیف بے قیاس
ہست رب الناس را باجانِ ناس(۱)

یہ ایک ایسا اتصال اور ایسا قرب ہے جسے ہم کسی شے پر قیاس نہیں کر سکتے' اسے ہم کسی مثال سے سمجھ بھی نہیں سکتے۔ اتصال ہے' قرب ہے' انتہائی قرب ہے کہ اس سے زیادہ قرب کا تصور ممکن نہیں۔ اس روحانی وجود کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا گہرا تعلق اور بڑا گہرا رشتہ ہے۔ ہر انسان خود اپنے اندر محسوس کرتا ہے کہ اندر ایک خیر و شر کی کشمکش برپا ہے۔ کوئی شے اندر سے کھینچتی ہے برائی کی طرف اور کوئی شے اندر ہے جو مجھے برائی پر ملامت کرتی ہے اور مجھے خیر کی طرف کھینچتی ہے۔ اگر آپ کے پاس ایک ہی روٹی ہے' کچھ اور نہیں ہے اور کوئی سائل آ گیا تو آپ کے اندر ایک کشمکش ہوگی۔ کوئی قوت کہے گی کہ یہ روٹی اپنے پاس رکھو' یہ تو تمہاری ضرورت کو بھی کفایت نہیں کر رہی' دوسرے کو حصہ دار بنانے کا کوئی سوال نہیں۔ لیکن کوئی شے اندر ہی اندر آپ کو راغب کرے گی کہ نہیں اس کے پاس ایک بھی روٹی نہیں ہے' اس کو بالکل فاقہ ہو جائے گا' مجھے چاہیے کہ میں اپنی روٹی میں اس کو شریک کروں۔ یہ ایک کشمکش ہے جو ہر انسان کا ہر وقت کا تجربہ ہے' ہر ایک کا ذاتی احساس ہے' جسے ہر شخص اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ یہ دو قوتیں ہیں جو اندر سے کھینچ رہی ہیں۔ یہ بات اچھی طرح جان لینا چاہیے' جیسا کہ اقبال نے کہا ہے ۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویﷺ سے شرارِ بولہبی

تاریخ میں جو خیر و شر نظر آ رہا ہے انسان کے باطنی خیر و شر کا مظہر ہے۔ اس حوالے سے جدید ماہرین نفسیات کے کام کا مطالعہ بھی مفید ہے۔ فرائڈ کے بعد نفسیاتِ جدیدہ کے میدان

(۱) یہ ایسا اتصال ہے کہ اس کی کیفیت نامعلوم ہے اور اسے کسی پر قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا...... ہاں مگر باری تعالیٰ انسانوں کی ارواح کے ساتھ ہے۔

میں کئی نظریات آئے مگر آج بھی اس کے نظریات کو مانا جاتا ہے۔ گویا وہ نفسیاتِ جدیدہ کا بادا آدم ہے۔ فرائڈ نے بڑی وضاحت کے ساتھ انسان شخصیت کے تین levels متعین کیے ہیں۔ اس کے نزدیک ایک idاور libido ہے' جسے ہم حیوانی داعیات (animal instincts) سے تعبیر کر سکتے ہیں' جو انسان کے اندر سفلی پہلو کا تقاضا بن کر ابھرتے ہیں۔ صحتِ مشاہدہ سے فرائڈ یہاں تک پہنچ گیا جس کا تذکرہ قرآن میں بایں الفاظ آتا ہے: ﴿إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ﴾ (یوسف:٥٣) ''یقیناً نفس (انسان کا حیوانی وجود) برائی کا حکم دیتا ہے''۔ اسے تو اپنی غرض ہے' اپنا پیٹ بھرنے سے دلچسپی ہے' اسے کوئی غرض نہیں کہ حلال ہے یا حرام ہے۔ اسے اس سے کوئی بحث نہیں کہ دوسرے کا پیٹ خالی ہے یا بھرا ہوا ہے۔ اس کے اندر جنسی جذبہ رکھا گیا ہے جو بڑا منہ زور ہے۔ یہ اپنی تسکین چاہتا ہے' اسے اس سے بحث نہیں ہے کہ حلال راستہ کون سا ہے اور حرام کون سا ہے۔ اس کے اندر ''حبِ تفوق'' (urge to dominate) بھی پائی جاتی ہے' جس کے لیے یہ حلال اور حرام' صحیح اور غلط (fair and foul) کی تمیز بھلا بیٹھتا ہے۔ اسی وجہ سے فرائڈ نفسِ امارہ کے لیے id and libido کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ اس کے اوپر ایک انسانی شخصیت ہے' حقیقت باطنی ہے' اس کی انا یا خودی (ego) ہے۔ پھر بلند ترین درجے میں اس کی فوق انا یا ماورا خودی (super ego) ہے۔ چنانچہ خیر و شر کی کشمکش انسان کے دونوں وجودوں کے مابین جاری ہے۔ ایک اس کا روحانی وجود ہے اور ایک حیوانی وجود ہے۔ حیوانی وجود خاکی الاصل ہے' جب کہ روحانی وجود کا مبدأ وہ ہے جو ملائکہ کے ہم پلہ ہے' بلکہ ملائکہ سے بھی افضل ہے۔ اس لیے کہ ملائکہ کو تو انسان کے سامنے سجدہ ریز کر دیا گیا۔

انسان کے اندر جو دو وجود ہیں' دونوں کے تقاضے مختلف ہیں۔ آج شاید اس بات کا مذاق اڑایا جا رہا ہے' لیکن اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اس روح کے لیے جسدِ حیوانی درحقیقت قید خانہ ہے۔ جسد پر روح کا غلبہ ہو جائے تو پھر پوری دنیا بندۂ مومن کے لیے قید خانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وہ بات ہے جو نبی مکرم ﷺ نے صراحتاً فرمائی ہے: ((اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ))[1] ''دنیا مؤمن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت کی مانند ہے''۔

(١) شعب الایمان للبیہقی' التاسع والثلاثون من شعب الایمان وهو باب فی المطاعم ...... الفصل الثانی فی ذم کثرة الاکل۔

روح ہمارے حیوانی وجود کے پنجرے میں قید ہے اور اپنے ربّ کی طرف رجوع کرنا چاہتی ہے۔ اس کا میلان ربّ کی طرف ہے' اسے اگر تسکین حاصل ہوتی ہے تو ذکرِ ربّ سے ہوتی ہے' اسے اگر انشراح ہوتا ہے تو معرفتِ ربّ سے ہوتا ہے۔ وہ ایک دہکتی ہوئی بھٹی ہے جس کے اندر محبتِ خداوندی جوش مار رہی ہے۔ میں جان بوجھ کر لفظ عشق استعمال نہیں کر رہا' اس لیے کہ یہ لفظ قرآن وسنت میں استعمال نہیں ہوا' فارسی شاعری میں آیا ہے۔ اس کا مفہوم درست ہے' لیکن ہمیں چاہیے کہ ہم ان اصطلاحات کی طرف رجوع کریں جو کتاب وسنت میں آئی ہیں۔ نئے الفاظ جب بھی آئیں گے اضافی مفہوم لے کر آئیں گے' تاہم عارضی طور پر نئی اصطلاحات کا استعمال ناگزیر ہے۔ ہر دور میں جو ذہنی صغریٰ کبریٰ بنتا ہے وہ اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ذہنی رابطے اور ابلاغ (communication) کے لیے جدید اصطلاحات کا استعمال کیا جائے۔ لیکن ان کو مستقلاً اختیار نہیں کرنا چاہیے۔

لفظ عشق مولانا رومؒ نے استعمال کیا ہے۔ اسی طرح دورِ حاضر میں رومیٔ ثانی علامہ اقبال نے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ جب کہ قرآن وسنت لفظ محبت استعمال کرتے ہیں۔ بہر کیف محبتِ خداوندی کی ایک آگ روح کے اندر ہے۔ اکثر وبیشتر انسانوں کا حیوانی وجود اس روح کو دبائے ہوئے ہوتا ہے' چنانچہ اس کے بھاری بوجھ تلے یہ روح سسکتی رہتی ہے' تڑپتی ہے' بے چینی محسوس کرتی ہے' لیکن ہمارے جسم کے تقاضے' بطن وفرج کے تقاضے' ہماری شہوات' ہمارے اوپر اس طرح مسلط ہیں اور ان ہی پر ہماری توجہ اتنی مرکوز ہے' ان کے لیے ہماری بھاگ دوڑ اس شدت کے ساتھ ہو رہی ہے کہ اپنے دوسرے وجود کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔ وہ ایک طرح سے بالکل نظر انداز (ignore) ہو کر ایک طرف تڑپتی رہتی ہے' ایک عرصہ تک بے چین رہتی ہے' مگر بالآخر ہوتا یہ ہے کہ روح گویا اس مادی وجود کے اندر دفن ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ چلتا پھرتا انسان اس روح کے لیے مقبرہ بن جاتا ہے۔ بلکہ اس کے لیے لفظ ''تعزیہ'' استعمال کر لیجیے۔ اس لیے کہ تعزیہ چلتا ہے' مقبرہ کسی ایک جگہ پر کھڑا رہتا ہے۔ یہ انسان روحانی طور پر مر چکا ہے' اس کی روح دفن ہو چکی ہے۔ اب جن آیات کا میں نے شروع میں حوالہ دیا تھا' ان پر غور کر لیجیے:

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝﴾ (الشمس)

''اور قسم ہے نفس کی اور جیسا کہ اُسے اُس نے ٹھیک بنا دیا۔ پھر سمجھ دی اُس کو نافرمانی کی

اور تقویٰ کی۔ تحقیق مراد کو پہنچا جس نے اس کو سنوارا۔ اور نامراد ہوا وہ جس نے اسے خاک میں ملا چھوڑا۔''

ایک تو اس کا ظاہری مفہوم ہے جو ہر ایک کے سامنے ہے۔ کامیاب ہو گیا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا' اس کو سنوار لیا' اس کو رزائل سے پاک کر لیا۔ اور ناکام ہوا جس نے اس کو مٹی میں دبا دیا۔ دَسَّ ' یَدُسُّ کے معنی ہوتے ہیں گاڑ دینے اور دبا دینے کے۔ قرآن مجید میں کفارِ مکہ کے بارے میں آیا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ کسی کے گھر بیٹی پیدا ہو جاتی ہے تو اس فکر میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس کو ذلت برداشت کرتے ہوئے زندہ رکھوں یا مٹی میں دبا دوں؟ ﴿اَیُمۡسِکُهٗ عَلٰی هُوۡنٍ اَمۡ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ﴾ (النحل:۵۹) اسی طرح آپ غور کریں کہ فلاح کامیابی کو کہتے ہیں' لیکن یہ لفظ بنا ہے فَلَحَ یَفلَحُ سے' جس کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو پھاڑنا' توڑنا۔ عربی محاورہ ہے: اِنَّ الحَدِیْدَ بالحَدِیْدِ یُفلَحُ ''لوہا لوہے سے کاٹا جاتا ہے''۔ ''فلاّح'' جدید عربی میں کسان کو کہتے ہیں کہ وہ اپنے ہل کی نوک سے دھرتی کے سینے کو چیرتا ہے۔ اسی طرح انسان کے مادی وجود کے اندر اس کی اصل حقیقت مضمر ہے۔ لہٰذا اس مادی وجود کو کچھ توڑنا پھوڑنا ہوگا اور اس میں سے اصل حقیقت کو برآمد کرنا ہوگا۔ دراصل لفظ فلاح کے اندر وہ حقیقت مضمر ہے کہ کوئی شے سینے میں کہیں دبی ہوئی ہے۔ سورۃ المؤمنون کی پہلی آیت ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴾ کا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فرزندِ ارجمند شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے ''موضح القرآن'' میں بہترین ترجمہ کیا ہے: ''کام نکال لے گئے وہ اہل ایمان''...... جیسے کوئی شے دفن تھی' بند تھی' اس پر غلاف آ چکا تھا' اس پر پردے آ گئے تھے' اسے پھاڑا ہے' توڑا ہے اور اس میں سے اس حقیقت کو برآمد کیا ہے۔ یہ ہے فلاح کی اصل حقیقت۔ اسی طرح ایک جملہ اپنشد میں ہے' جسے میں اکثر quote کیا کرتا ہوں۔ کیونکہ حکمت کے بارے میں ہمارا تصور یہ ہے کہ یہ نوعِ انسانی کی مشترک متاع ہے۔ حدیث میں آتا ہے: ((اَلْکَلِمَةُ الْحِکْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَحَیْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا))[1] ''حکمت کی بات تو مومن کی گمشدہ متاع کی مانند ہے۔ وہ اس کا زیادہ حقدار ہے جہاں بھی اسے پائے''۔ چنانچہ اپنشد کا جملہ ہے:

"Man in his ignorance identifies himself with the material sheets which encompass his real self."

''انسان اپنی نادانی اور جہالت میں اپنے آپ کو اُن مادی غلافوں سے تعبیر کر بیٹھتا ہے

(۱) جامع الترمذی' کتاب العلم' باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادة ......

جن کے اندر اِس کی اصل حقیقت مضمر اور پنہاں ہے۔''

اصل حقیقت اس کی رُوح ہے جو اس کے جسد خاکی میں پھونکی گئی تھی۔ ذہن میں رکھیے ہمارے اکثر متکلمین کے نزدیک روح ایک ''جسم لطیف'' ہے اور جسد ''جسم کثیف'' ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ صرف ایک معنوی حقیقت ہو جس کا کوئی وجود نہ ہو۔ اور یہ معاملہ ہمارے جسم سے ماورا ہے' اس کو ہم نہیں جان سکتے۔ میں ایک سادہ سی بات عرض کیا کرتا ہوں کہ ہمیں تو آج تک یہ بھی معلوم نہیں کہ ہماری جان کا ہمارے جسم سے کیا تعلق ہے؟ آپ فزیالوجی کی ضخیم سے ضخیم کتابیں پڑھ جایئے' کہیں پتا نہیں چلے گا کہ جان کا تعلق جسم سے کس طور سے ہے' کس عضو سے ہے۔ نیند کا ہمیں آج تک پتا نہیں کہ دماغ کے کس گوشے میں ہے کہ switch on کریں تو آدمی جاگ جائے' off کریں تو آدمی سو جائے۔ یہ سب ہماری پہنچ اور دسترس سے بہت بعید ہے۔ اگر جان کے بارے میں ہمیں معلوم نہیں تو روح اس سے کہیں لطیف تر حقیقت ہے۔ اس تعلق پر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنے حواشی میں بہت خوب صورت انداز میں یہ فارسی شعر نقل کیا ہے۔

جاں نہاں درجسم' او در جاں نہاں

اے نہاں اندر نہاں اے جانِ جاں(۱)

یہ ہے ہمارا روحانی وجود۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ہمارا مادی وجود' اس کے تقاضے اور ہمارے سفلی میلانات روح پر چھا جاتے ہیں تو مادی وجود کے اندر روح دفن ہو کر رہ جاتی ہے۔ آگے الفاظ ہیں: ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا۞﴾ (الشمس) یعنی نامراد ہوا وہ جس نے اپنی روح کو دفن کر دیا۔ ایک اور مقام پر غور کیجیے:

﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۙ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۞﴾ (الاعراف)

''ہم نے انسانوں اور جنوں میں سے بہت سوں کو پیدا کیا ہے جہنم کا ایندھن بننے کے لیے۔ ان کے دل ہیں مگر وہ ان سے غور وفکر نہیں کرتے' ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ اُن

(۱) ''روح ہمارے جسم کے اندر پوشیدہ ہے اور وہ (ذاتِ باری تعالیٰ) ہماری روح کے اندر پوشیدہ ہے..... اے وہ جو دو پردوں میں پوشیدہ ہے اے جانِ جاں!''

سے دیکھتے نہیں' اُن کے کان ہیں مگر وہ اُن سے سنتے نہیں۔ یہ جانوروں کی مانند ہیں
بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے' یہی لوگ غافل ہیں۔''

یہ تعبیر کا ایک انداز ہے۔ یہاں جبر وقدر کی بحث کو ذہن سے ذرا دور رکھئے! اب اس کی تعبیر کیا ہے؟ یہ جہنم کا ایندھن بننے والے انسان کون ہیں؟ ان کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کون سا سننا ہے جس کی نفی ہو رہی ہے؟ کون سا دیکھنا ہے جس کی نفی ہو رہی ہے؟ کیا ابوجہل اندھا اور بہرا تھا؟ کیا ابولہب اندھا اور بہرا تھا؟ یہ تو بظاہر بڑے سوجھ بوجھ والے اور بھلے چنگے لوگ تھے۔ ابولہب کی تو بڑی بڑی موٹی آنکھیں تھی' بہت سرخ وسفید رنگت تھی' ہر اعتبار سے ایک خوب رو اور خوبصورت انسان ـــــ لیکن قرآن کیوں کہہ رہا ہے کہ یہ اندھے ہیں؟ کون سی ان کی بینائی ہے' کون سی سماعت ہے جو معطل ہو چکی ہے؟ وہ کون سا دل ہے جس پر مہر لگ چکی ہے؟ـــــ یہ روح کی حقیقتیں ہیں جن کو بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ مر چکی ہیں۔ وہ اب ﴿اَمۡوَاتٌ غَیۡرُ اَحۡیَآءٍ﴾ (النحل: ۲۱) ہیں۔ یہ مُردہ ہیں' زندہ نہیں ہیں۔ ان کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّکَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰی﴾ (النمل: ۸۰) ''اے نبی ﷺ آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے!'' اس آیت کا تعلق خواہ مخواہ سماعِ موتی سے جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ ان مُردوں کے بارے میں نہیں کہا جا رہا جو قبروں میں دفن ہو چکے ہیں۔ یہ تو وہ ہیں جو زندہ چلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں۔ اس کے بارے میں بڑی پیاری تعبیر اقبال کے مصرعے میں ہے کہ ؏ ''روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد''۔ ایک Biological Life تو تھی' ایک حیاتِ حیوانی اندر موجود تھی' لیکن وہ رُوحِ ربانی ختم ہو چکی تھی' سلب ہو چکی تھی' یا وہ مقبرے یا تعزیے کے اندر مدفون تھی۔ ان کے بارے میں فرمایا: ﴿اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ﴾ ''یہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں''۔ یہ انسان نظر آتے ہیں' حقیقت میں چوپائے ہیں۔ یہ دو ٹانگوں پر چلنے والے' انسان کی شکل میں حیوان ہیں۔ اور حیوان بھی کیسے کیسے؟؟

مولانا احمد علی لاہوریؒ اپنا ایک مکاشفہ بیان فرمایا کرتے تھے جسے متعدد حضرات نے ان سے براہِ راست سنا ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ مولانا کہتے تھے کہ میں نوجوانی کے دور میں لاہور کے کشمیری بازار' جو اُس وقت بڑا گنجان آباد علاقہ تھا' چلا گیا۔ اچانک ایک بزرگ درویش مجھے ملے اور انہوں نے کہا میں کسی انسان سے ملنا چاہتا ہوں' تم مجھے کسی انسان کی خبر دے سکتے ہو؟ (انسانم آرزوست!) اس پر مولانا نے کہا کہ آپ کو انسان نظر نہیں آ رہے؟ بھرا بازار ہے' گاہک ہیں' دکاندار ہیں۔ ان بزرگ نے جذب کی کیفیت میں کہا' میاں! مجھے تو

یہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا۔ ان کا یہ فرمانا تھا کہ بس اچانک مجھے بھی ایسا محسوس ہوا کہ کسی دکان پر کوئی بندر، کسی پر کوئی بھیڑیا بیٹھا ہے اور کہیں کوئی سور چل رہا ہے۔ اصل میں ان کی شخصیتوں کی جو معنوی حقیقت تھی گویا وہ منکشف ہو کر سامنے آ گئی۔ لباس پہنے ہوئے سفید پوش انسان کی حقیقتِ معنوی چھپی ہوئی ہے۔ اصل شخصیت جو مضمر ہے وہ ایک سور کی شخصیت ہے، جس کے اوپر شہوت بری طرح چھائی ہوئی ہے۔ کوئی حریص بندر کی صورت میں ظاہر ہوا، کوئی بھیڑیا ہے جو کاٹنے اور چیرنے کے لیے بے تاب ہے۔ یہ انسان کا معاملہ ہے۔ قرآن مجید نے تو پھر بھی نرم الفاظ استعمال کیے ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ﴾ ''یہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں''۔ اس لیے گئے گزرے ہیں کہ حیوانوں کو تو پیدا ہی اس سطح پر کیا گیا تھا، لہٰذا وہ اس سطح پر ہیں تو ان کے لیے کوئی عار اور شرم کی بات نہیں ہے، مگر انسان کا تو معاملہ یہ ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝﴾ (التین) ''تحقیق ہم نے انسان کو بہترین انداز پر تخلیق کیا''۔ وہ احسن تقویم پر پیدا ہونے والا انسان اس پستی میں مبتلا ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بارہا آیا ہے۔ اہم مضامین قرآنِ مجید میں کم از کم دو جگہ ضرور ملیں گے۔ چنانچہ نوٹ کریں کہ یہی مضمون سورۃ الحج میں بایں الفاظ آیا ہے:

﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ۝﴾ (الحج)

''کیا وہ لوگ زمین میں گھومے پھرے نہیں کہ ہوتے اُن کے دل کہ وہ ان سے سوچتے، یا ہوتے ان کے کان کہ وہ ان سے سنتے؟ پس آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔''

آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں، دل اندھے ہو جاتے ہیں۔ ابوجہل کی آنکھ اندھی نہیں تھی، دل اندھا تھا۔ یہ ہے روحانی وجود کی حقیقت جس کے لیے امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''ملکیت'' اور ''بہیمیت'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ شیخ سعدیؒ کا شعر ہے ؎

آدمی زادہ طرفہ معجون است
از فرشتہ سرشتہ وز حیواں(۱)

(۱) اولادِ آدم عجب معجون مرکب ہے...... اس میں فرشتوں والی صفات بھی ہیں اور حیوانوں والی بھی!

انسان کی شخصیت کے دو رُخ ہیں' اس میں ملکیت بھی ہے اور بہیمیت بھی ہے۔ اس میں حیوان بھی ہے' فرشتہ بھی۔ لیکن جب وہ حیوان غالب آ جاتا ہے اس طور سے کہ فرشتے والی صفت دفن ہو جاتی ہے تو پھر وہ انسان وجود میں آتے ہیں جو غالب اکثریت میں نظر آ رہے ہیں۔ دوسری جانب اس دلدل سے نکلنے کے لیے سورۃ التین میں فرمایا: ﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَھُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ؕ﴾ ''سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور عمل صالح کیے' پس اُن کے لیے اجر ہے بے حساب۔''

سلوکِ قرآنی کے تین مراحل

اگر شعور' ہوش' توجہ اور تنبہ ہو جائے تو اب تین مراحل ہیں جن سے گزرنا ہوگا۔

(۱) مجاھدہ مع النفس: سلوکِ قرآنی کا سب سے پہلا مرحلہ مجاہدہ مع النفس کا ہے۔ ہم یہ جان چکے ہیں کہ اصل شے ہماری باطنی کشمکش اور ہمارے نفس کی امّارۃ بالسّوء ہونے کی کیفیت ہے۔ یہی ہے جو لوگوں کی اس ہلاکت کا باعث ہے کہ وہ زندہ ہوتے ہوئے حقیقت کے اعتبار سے مردہ ہیں' اس لیے کہ ان کی باطنی صلاحیت سلب ہو چکی ہے اور وہ اب حیوانوں کا سا دیکھنا دیکھ رہے ہیں اور حیوانوں کا سا سننا سن رہے ہیں۔ انسانی دیدن اور انسانی شنیدن انہیں حاصل نہیں۔ اسی لیے اقبالؔ نے کہا ہے ؎

دم چیست؟ پیام است! شنیدی نہ شنیدی؟
در خاکِ تو یک جلوۂ عام است! ندیدی؟
دیدن دگر آموز! شنیدن دگر آموز!

اقبالؔ ہی نے کہا تھا ؎

ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

چنانچہ پہلا مرحلہ ہے مجاہدہ مع النفس۔ اس کے لیے تین اصلاحات ذہن میں ٹانک لیجیے: ۱۔ضبطِ نفس' ۲۔تہذیبِ نفس' ۳۔تزکیۂ نفس۔ اس روح کو اگر پروان چڑھانا ہے' اگر اس کی ترقی پیش نظر ہے' اگر چاہتے ہیں کہ یہ بیدار ہو' اسے تقویت پہنچے' ہمارے وجود پر غالب آئے تو اس کو اتنا قوی اور توانا کرنا ہوگا کہ یہ نفس پر قابو یافتہ ہو جائے۔ اس کی بہترین مثال ہمارے بزرگ دیتے چلے آئے ہیں کہ جسم درحقیقت مرکب (سواری) ہے' جبکہ ہمارا روحانی وجود'

ہماری انا' یا علامہ اقبال کے فلسفے کے مطابق ہماری خودی راکب ہے' یہ گھوڑے کے اوپر سوار ہے اور یہ گھوڑا بہت منہ زور ہے۔ اگر راکب کمزور ہو تو وہ گھوڑے کے رحم و کرم پر ہے' وہ جدھر چاہے اسے لے جائے اور جس کھائی میں چاہے پٹخ دے۔ لیکن اگر راکب (سوار) تقویت پا گیا ہے' مضبوط ہے' توانا ہے' جما بیٹھا ہے تو پھر گھوڑا اس کے لیے سرمایہ (asset) ہے۔ وہ اسے استعمال کرے گا' خیرات وحسنات اسی کے ذریعے سے کمائے گا' اسی کے ذریعہ اکتساب اعمال کرے گا' اور یہی استعداد ہے جو اس کے بروئے کار آئے گی۔ یہ اُس گھوڑے کی مانند ہے جس پر آپ سوار ہو کر منزلِ مقصود کی طرف چلے جا رہے ہیں' بشرطیکہ اس پر آپ کا کنٹرول ہو۔ اور اگر صورت برعکس ہو جائے اور گھوڑا آپ پر قابو پا لے' چونکہ آپ کمزور ہیں تو پھر آپ کا جو حشر ہوگا وہ سب کو معلوم ہے۔ یہ ضبطِ نفس' تہذیبِ نفس اور تزکیۂ نفس اسی لیے ہیں کہ روح کا جسم پر کنٹرول رہے۔ قرآن حکیم میں آتا ہے:

﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿٤٠﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٤١﴾﴾ (النزعت)

''اور جو کوئی ڈرتا رہا اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے اور روکتا رہا اپنے نفس کو خواہشات سے' تو جنت ہی اُس کا ٹھکانہ ہے۔''

اور حدیث رسول ﷺ میں وضاحت ہے کہ:

((اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ))[1]

''اصل ہوشمند اور باشعور وہ لوگ ہیں جو اپنے نفس کو قابو میں رکھیں۔ (اسے اپنا محکوم اور مطیع بنائیں) اور عمل کریں موت کے بعد والی زندگی کے لیے۔''

اس حوالے سے عبادات کی پابندی بہت ضروری ہے۔ پہلی عبادت نماز ہے جو اسلام کا رکن ہے اور ایمان کی تجدید و آبیاری کا اور غفلت سے بچانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ پانچ وقت ماحول سے نکل کر عہد کو تازہ کرو۔ اپنے پروردگار کے حضور سجدے میں گرو' لوحِ جبیں تازہ کرو' اپنا عہدِ بندگی استوار کرو: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿٤﴾﴾ ''ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے۔''

---

(۱) جامع الترمذی' کتاب صفة القیامة والرقائق والورع ..... باب ماجاء فی صفة اوانی الحوض...... و کتاب الزهد لاحمد بن حنبل۔

تزکیہ نفس کے حوالے سے دوسری اہم عبادت روزہ کی ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ باقی تمام نیکیوں کا بدلہ تو دس سے ستر گنا تک ملے گا' لیکن ((اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ))(١) "روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا"۔ عبادات میں اس کی امتیازی شان یہ ہے کہ یہ نفس کو لگام دینے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ یہ ضبطِ نفس اور تہذیبِ نفس کا بہترین طریقہ ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا: ((اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ)) "روزہ ڈھال ہے"۔ نفس کے حملوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا ہے تو روزے کی ڈھال اپنے ہاتھ میں لو۔

مزید برآں تزکیہ نفس کے لیے مؤثر ترین شے انفاقِ مال ہے۔ میں اس بارے میں اپنا احساس آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص دوسری عبادات کے ڈھیر کے ڈھیر لگا دے لیکن بخل اس کے اندر رہ گیا' مال کی محبت رہ گئی تو یہ بات قرآن وسنت کے واضح نصوص سے معلوم ہوتی ہے کہ تزکیہ نہیں ہوا۔ محض دھوکا اور فریب ہے جسے تزکیہ سمجھا جا رہا ہے۔ کسی کو مشکل میں دیکھ کر اگر دل سے مدد کرنے کا جذبہ نہیں ابھرتا تو ابھی تزکیۂ نفس کی منزل بہت دور ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ یُّحْرَمُ الرِّفْقَ یُحْرَمُ الْخَیْرَ کُلَّہٗ))(٢) "جو شخص دل کی نرمی سے محروم کر دیا گیا وہ کلُ کے کلُ خیر سے محروم کر دیا گیا"۔ اس لیے کہ نفس کی اصل بیماری "حبِ دُنیا" اور اس کی علامت "حبِ مال" ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ۙ﴿٨﴾ وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ۙ﴿٩﴾ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی ؕ﴿١٠﴾﴾ (اللیل) "اور جس نے بخل کیا اور بے پروا رہا' اور جھوٹ جانا اور جھٹلایا نیکی کو' سو اُس کو ہم سہج سہج پہنچا دیں گے سختی میں"۔ قرآن نے یونہی نہیں کہہ دیا: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ ﴿٩٢﴾﴾ (آل عمران) "تم نیکی کی حقیقت کو اُس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک خرچ نہ کرو اُس میں سے جسے محبوب رکھتے ہو' اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اللہ تبارک وتعالیٰ اُسے جاننے والا ہے"۔ علاوہ ازیں آیت البرّ میں فرمایا گیا:

﴿وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ
وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ

---

(١) صحیح البخاری ۔ وصحیح مسلم ۔ وجامع الترمذی' کتاب الصوم' باب ما جاء فی فضل الصوم۔

(٢) سنن ابی داوٗد' کتاب الادب' باب فی الرفق۔

وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴿١٧٧﴾ (البقرۃ)

''بلکہ اصل نیکی اُس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر' یوم آخر پر' فرشتوں پر' کتابوں پر اور انبیاء پر۔ اور دیا اُس نے مال اس کی محبت کے علی الرغم رشتے داروں کو' یتیموں کو' محتاجوں کو' مسافروں کو' سائلوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں۔ اور قائم کی اس نے نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔ اور پورا کرنے والے اپنے عہد کے جبکہ کوئی باہم معاہدہ کرلیں۔ اور بالخصوص صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں' تکالیف و مصائب پر اور جنگ کے وقت۔ یہی ہیں وہ لوگ کہ جو واقعۃً راست باز ہیں' اور یہی ہیں وہ لوگ جو حقیقۃً متقی ہیں۔''

یہاں نماز اور زکوٰۃ کو علیحدہ اور ایتائے مال کو علیحدہ ذکر کیا گیا۔ ''خرچ کرو اللہ کی راہ میں!'' یہ ہے اصل میں تزکیۂ نفس کا مؤثر ترین ذریعہ' اور اگر خدانخواستہ اس سے صرفِ نظر کیا گیا تو مطلوب حاصل نہیں ہوگا۔ ہر عبادت کی اپنی تاثیر ہے۔ ان عبادات میں اپنی اپنی نورانیت ہے' ہر ایک کی اپنی افادیت ہے۔ لہٰذا اگر ایتائے مال کو By pass کر دیا گیا' اگر حبِ مال کی کیفیت جوں کی توں رہی' اگر بخل باقی رہا' ﴿اَلَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ﴿٢﴾﴾ (الھمزۃ) ''جس نے سمیٹا مال اور گن گن کر رکھا'' کی کیفیت برقرار رہی تو یہ وہ bottle neck ہے جو انسانی شخصیت کے ارتقاء میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس رکاوٹ کو قرآن مشکل گھاٹی سے تعبیر کرتا ہے:

﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ﴿١١﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿١٢﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿١٣﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِىْ يَوْمٍ ذِىْ مَسْغَبَةٍ﴿١٤﴾ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ﴿١٥﴾ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ﴿١٦﴾﴾ (البلد)

''پھر بھی وہ اس گھاٹی کو عبور نہ کرسکا' اور تمہیں کیا پتا کہ وہ گھاٹی کیا ہے۔ کسی کی گردن چھڑا دینا' یا پھر کسی بھوک والے دن میں کھانا کھلا دینا' کسی رشتہ دار یتیم کو یا کسی مسکین کو جو مٹی میں رُل رہا ہو۔''

اگر یہ کام نہیں کر سکے تو دوسری عبادات کے ڈھیر کے ڈھیر بھی تلافی نہیں کر سکتے۔ ہر عبادت کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ جیسے آپ کو معلوم ہے' نمازیں آپ لاکھوں کروڑوں پڑھ لیں' فرض روزے کا قائم مقام کوئی نماز نہیں بن سکتی۔ اسی طرح نماز اور روزہ آپ کتنا ہی کر لیں زکوٰۃ کے وہ قائم مقام نہیں بن سکتے۔ زکوٰۃ فرض ہے اور زکوٰۃ ہی دی جائے گی تو فرض ادا ہوگا۔ ہر شے کا

اپنا مقام ہے۔ جہاں تک نماز کا تعلق ہے' وہ اصل میں تجدید ایمان کا مؤثر ترین ذریعہ ہے' ذکر اور یاددہانی ہے۔ اس کے بعد روزہ نفس کے تقاضوں کو لگام دینے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ ساتھ ہی نفس کا سب سے بڑا رذیلہ مال کی محبت ہے اور اس کا علاج ''انفاق فی سبیل اللہ'' ہے۔ یہ ہے وہ جامع پروگرام جس سے یہ مجاہدہ مع النفس ہوگا۔ اس سے آپ نفس کے منہ زور گھوڑے کو لگام دیں گے۔ اس سے گویا آپ کا پہلا مرحلہ طے ہوگیا۔

(۲) حُبِّ ربّ :دوسرا مرحلہ ''حبِ ربّ'' یعنی پروردگار کی محبت ہے۔ جب آپ نے اپنے نفسِ امارہ کو لگام دے دی' اس کے جو رذائل ہیں ان سے اپنے آپ کو محفوظ کرلیا تو اب آپ کے روحانی وجود کو جو ریلیف (relief) میسر آیا ہے' وہ اپنے رب کی جانب متوجہ ہوگا۔ چنانچہ غور کیجیے سورۃ البقرۃ کے تیئیسویں رکوع میں احکامِ صوم والی آیات کے فوراً بعد یہ آیت آرہی ہے:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ﴿۱۸۶﴾﴾

''اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو آپ کہہ دیجیے کہ میں تو قریب ہی ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے میں اُس کی پکار کو سنتا ہوں' تو چاہیے کہ وہ میرا کہا مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں' تاکہ وہ راہِ راست پر آجائیں۔''

اب یہ روح کو ریلیف ملا ہے' نفس کا بوجھ اس پر سے کم ہوا ہے' وہ دباؤ جس کے نیچے وہ سسک رہی تھی اس سے رستگاری ملی ہے تو وہ اپنے ربّ کی طرف متوجہ ہوگی۔ اب وہ جذبہ جو اس کے اندر متوارث (inherent) موجود ہے' وہ بروئے کار آئے گا۔ یعنی ع ''اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن'' اور جو کہا گیا ہے: كُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ اِلٰى اَصْلِهٖ (ہر شے اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے)۔ اس روح کا اصل تعلق ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ہے[۱]۔ اس کے اندر

(۱) اس موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحبؒ علامہ اقبال کی یہ رُباعی سنایا کرتے تھے:

مرا دل سوخت بر تنہائی او	''میرا دل جلتا ہے اُس کی تنہائی پر
کنم سامانِ بزم آرائی او	اُس کی بزم آرائی کے لیے سامان کر رہا ہوں
مثالِ دانہ می کارم خودی را	بیج کی طرح خودی کو پال رہا ہوں
برائے اُو نگہدارم خودی را	اُس کے لیے خودی کی نگہبانی کر رہا ہوں''۔

اور Plotinus کا قول ہے: ''Flight of alone to the alone''۔
تفصیل کے لیے دیکھیے محترم ڈاکٹر صاحبؒ کی سورۃ الحدید کی تفسیر پر مبنی کتاب ''اُمّ المسبحات'' (مرتب)

ایک شوقِ لقاء بھی ہے' ایک محبت کا جذبہ بھی ہے' لیکن نفس کے تقاضوں کے تحت دبا ہوا ہے' جو اب تک ظاہر نہیں ہوا' اب وہ ابھر کر سامنے آئے گا۔ اس کو قرآن مجید کہتا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (البقرة:١٦٥) ''اور اہل ایمان اللہ کی محبت میں سب سے بڑھ کر ہیں''۔

واضح رہے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی اللہ کی محبت کا ذکر آئے تو سمجھ لیجیے کہ اس کے اندر رسول ﷺ کی محبت کا ذکر بھی موجود ہے۔ یہ وہاں مضمر ہے' اس کو ظاہر کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ دو اعتبارات سے اللہ اور اس کا رسول ﷺ ایک وحدت بن جاتے ہیں۔ اطاعت کے اعتبار سے اور محبت کے اعتبار سے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ﴾

(آل عمران)

''کہہ دیجیے اطاعت کرو اللہ کی اور رسول (ﷺ) کی' پس اگر تم رُوگردانی کرو گے تو اللہ ایسے کافروں کو پسند نہیں کرتا۔''

جبکہ سورۃ التوبۃ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾

''کہہ دیجیے (اے نبی ﷺ!) اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور خاندان اور وہ مال جو تم نے بڑی محنت سے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں تمہیں مندے کا خدشہ رہتا ہے اور وہ گھر جو تمہیں بڑے پسند ہیں' تم کو زیادہ محبوب ہیں اللہ سے' اُس کے رسول سے اور اُس کے راستے میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ لے آئے' اور اللہ ہدایت نہیں دیتا نافرمانوں کو۔''

معلوم ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے شدید ترین محبت اور اللہ سے ملاقات کا شوق واشتیاق مطالباتِ دین میں سے ہے۔ اس کے لیے نبی اکرم ﷺ کے انتقال کے وقت کی کیفیت ذہن میں رکھیے۔ آپ کو معلوم ہے انبیاء و رسل کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار ملتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اپنے انتقال سے متصل قبل فرمایا:

((لَنْ يُقْبَضَ نَبِيٌّ قَطُّ حَتّٰى يَرٰى مَقْعَدَهُ مِنَ الْجَنَّةِ ثُمَّ يُخَيَّرُ))(۱)

''کوئی پیغمبر اُس وقت تک وفات نہیں پاتا جب تک بہشت میں اپنا ٹھکانا نہیں دیکھ لیتا' پھر اس کو اختیار دیا جاتا ہے (اگر چاہے تو دنیا میں مزید رہے یا مراجعت اختیار کرے۔)''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس پر رو پڑے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم حیران ہو گئے تھے کہ کیا معاملہ ہے؟ دراصل بندۂ مومن کے لیے یہ ایک بڑی لطیف حقیقت ہے کہ وہ اس دنیا کی زندگی میں رہنے پر کبھی راضی نہیں ہوتا۔ یہ ''سِجْنُ الْمُؤْمِن'' ہے۔ یہ اس کے لیے liability ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے کسی CSP آفیسر کو بلوچستان کے دور دراز کونے میں کہیں پر لگا دیا جائے۔ چلا تو وہ جائے گا کہ ملازمت کا تقاضا ہے مگر مستقلاً رہنے پر راضی نہیں ہوگا۔ دنیا میں رہنا اللہ کے حکم سے ہے۔ یہ ہمارے لیے place of duty ہے۔ جب تک بھی اللہ ہمیں یہاں رکھے یہاں رہنے پر راضی رہنا ہے' مگر یہاں زندگی کی طوالت کی آرزو یا تمنا نہیں ہونی چاہیے۔ قرآن میں یہودیوں کا وصف بیان ہوا ہے: ﴿يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ (البقرہ:۹۶) ''اُن میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ کاش اُسے ہزار سال کی عمر دے دی جائے''۔ اس کے برعکس بندۂ مومن کی شان تو وہ ہے جو اقبال نے بیان کی کہ ؎

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست(۲)

آخری کلمات جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے ادا ہوئے وہ یہ تھے: ((اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى))(۳) ''اے اللہ! اے بلند ترین رفیق!''

گویا جو وقت بھی یہاں گزرا ہے وہ ایک فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لیے تھا۔ ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جو روحانی اور قلبی تعلق ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ تھا' ہمارے لیے تو وہ تصور سے ماوراء ہے۔ لیکن دنیا میں رہتے ہوئے کوئی لطیف حجاب تو تھا' کوئی پردہ تو تھا نا۔ وہ بھی اتنا شاق گزر رہا ہے! یہ ہے محبت' یہ ہے شوقِ لقاء! اللہ سے ملاقات' اس کے حضور حاضری کا شوق

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الدعوات' باب دعاءِ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۲) ''مردِ مؤمن کی نشانی میں تمہیں بتاؤں؟...... جب موت آتی ہے تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔''

(۳) صحیح البخاری' کتاب الدعوات' باب دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى۔

واشتیاق۔ اگر یہ نہیں ہے تو ایمان کی اصل لذت اور روح کی حیاتِ باطنی کا ابھی کوئی احساس تک نہیں ہے۔ ان روحانی کیفیات کا تو مزا ابھی چکھا ہی نہیں اُس شخص نے جس میں یہ محبت خداوندی ایک زندہ حقیقت قرار نہیں پائی۔ یہ حرارت اگر اس کے باطن کے اندر نہیں ہے تو وہ باطنی کیفیات سے عاری ہے۔

لا الٰہ اِلا اللہ کا مفہوم: صوفیاء کرام نے ''لا الٰہ اِلا اللہ'' کا جو مفہوم بیان کیا ہے صد فیصد درست ہے۔ توحید کی ایک سطح وہ ہے جس پر عوام ہوتے ہیں' وہ اس سے اُوپر نہیں جا سکتے۔ ان کے لیے ''لا الٰہ الا اللہ'' کا مفہوم یہ ہے کہ ''لا معبود اِلا اللہ...... لا رازق اِلا اللہ'' ...... یعنی کوئی معبود نہیں' کوئی رازق نہیں' کوئی مشکل کشا نہیں' کوئی حاجت روا نہیں سوائے اللہ کے''۔ یہ توحید کا پہلا درجہ ہے۔ لیکن اس سے اگلی منزل جہاں سے روح کی حیاتِ باطنی کا آغاز ہوتا ہے وہ ہے ''لا محبوب اِلا اللہ...... لا مطلوب اِلا اللہ...... لا مقصود اِلا اللہ'' ...... یعنی مقصود' مطلوب اور محبوبِ حقیقی کے درجے میں اللہ کے سوا کوئی نہ رہے۔ کوئی بھی اس مقام پر موجود ہے تو یہ شرک کی ایک قسم ہے۔ اگر کوئی بھی محبت اس محبت کے برابر براجمان ہوگئی تو یہی تو ہے جو اقبال نے کہا ہے۔

بتوں سے تجھ کو اُمیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

یہ ہیں درجہ احسان کے ثمرات۔ یہی وہ ثمرات ہیں جن کو ہمارے دین کی اصطلاح میں ''ولایت باہمی'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ اللہ اور اُس کے بندے کی باہمی دوستی ہے۔ اللہ بھی ولی ہے اہل ایمان کا' ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ (البقرۃ:۲۵۷) ''اللہ دوست ہے اہل ایمان کا' نکالتا ہے اُنہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف''۔ اور یہ جو واقعی حقیقی ایمان رکھنے والے ہیں' جن کے قلوب میں اور جن کی شخصیتوں میں ایمان رچ بس گیا ہے تو وہ اللہ کے دوست ہیں۔ ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ۝﴾ (یونس) ''آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے دوستوں کو نہ کوئی خوف لاحق ہوتا ہے نہ حزن۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے تقویٰ اختیار کیا''۔ انہیں خوف وحزن اس لیے نہیں ہے کہ وہ راضی برضائے رب ہیں ؏ ''ہر چہ ساقیِ ما ریخت عین الطاف است'' (جو کچھ میرے ساقی نے

میرے پیالے میں ڈال دیا وہی عین لطف و کرم ہے۔) وہ اس کشمکش اور پیچ و تاب میں مبتلا نہیں ہوتے کہ یوں ہونا چاہیے تھا' یوں کیوں ہوگیا؟ یہ کس نے کردیا اور یہ مجھ پر کس نے ظلم ڈھادیا؟ بلکہ "ماشاء اللّٰہُ کان وما لم یشأ لم یکن" (جو اللہ نے چاہا وہ ہوگیا اور جو نہ چاہا وہ نہیں ہوا۔) حدیث میں آیا ہے کہ تمام انسان مل کر اگر تمہیں کوئی نفع پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے جب تک کہ اللہ کا اذن نہ ہو' اور تمام انسان مل کر تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے جب تک کہ اللہ کا اذن نہ ہو۔ تو کس کا خوف' کس سے امید' کس کا ڈر' کس بات کا حزن؟ جو ہوا اللہ کا فیصلہ اسی میں تھا:

برون کشید ز پیچاکِ ہست وبود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا[۱]

یہ مقامِ رضا ہے۔ یعنی دوست کی رضا پر راضی رہنا ہے' جو اُس کا فیصلہ ہو قابلِ قبول ہے۔ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے تن من دھن لگا دینا اپنی جگہ ضروری ہے' لیکن اس میں بھی توکل صرف اللہ پر ہو کہ ہمارے کیے کچھ نہیں ہوگا' محنت کرنا ہماری ذمہ داری ہے' نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ علاج کرنا سنت ہے' کریں گے' لیکن شفاء دوا میں نہیں' اللہ کے اذن میں ہے۔ ہماری بھوک غذا سے نہیں مٹتی' اللہ کے اذن سے مٹتی ہے۔ پیاس پانی سے نہیں بجھتی' اللہ کے حکم سے بجھتی ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''لَا فَاعِلَ فِی الْحَقِیْقَةِ وَلَا مُؤَثِّرَ اِلَّا اللّٰہُ'' (اللہ کے سوا کوئی فاعلِ حقیقی' کوئی مؤثرِ حقیقی نہیں۔) تو یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ ہر فعل کے اندر دو اجزاء (components) ہیں۔ انسان ''کاسبِ اعمال'' ہے' جبکہ ''خالقِ اعمال'' اللہ ہے۔ چنانچہ انسان کے لیے ہر فعل پر اپنی نیت کے اعتبار سے اجر و ثواب یا عذاب و سزا ہے۔ لیکن ہوگا وہی جس میں اذنِ رب ہوگا۔

اسی طرح ''باہمی مذاکرہ'' ہے' تم اللہ کو یاد رکھو' اللہ تمہیں یاد رکھے گا: ﴿فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ (البقرة:۱۵۲) ''تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا''۔ حدیث قدسی ہے کہ میرا بندہ اگر مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں۔ میرا بندہ اگر مجھے محفل میں یاد کرتا ہے تو میں اُس کا اس سے اعلیٰ محفل میں ذکر کرتا ہوں یعنی ملائکہ مقربین کی

(۱) ہست و بود کی الجھنوں سے مجھے باہر نکال دیا...... کتنے ہی عقدے تھے جو مقامِ رضا کے حاصل ہو جانے سے حل ہو گئے۔

محفل میں۔ میرا بندہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ میرا بندہ میری طرف بالشت بھر آتا ہے تو میں اس کی طرف ہاتھ بھر آتا ہوں۔ یہ ہے باہمی تعلق۔ اسی طرح نصرتِ باہمی کا معاملہ ہے: ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ (محمد:۷) ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا''۔ تم اس کے دین کا جھنڈا تھامو' اقامت دین کی جدوجہد میں تن من دھن لگاؤ' اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ تو یہ ہے درحقیقت محبت باہمی اور ولایت باہمی کا ایک ایسا تعلق جو ایمان کا لُبِ لباب اور حاصل ہے۔ ایمان جب اس درجے کو پہنچ جائے کہ آپ کے احساسات میں' آپ کے نقطۂ نظر میں' آپ کی باطنی کیفیات میں یہ تبدیلی واقع ہو جائے تو یہ ہے ایمان کا حاصل!

نصب العین

اسی بات کو ایک بہت عظیم' مضبوط اور مدلل فلسفے کی حیثیت سے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے اپنی کتاب ''Manifesto of Islam'' میں پیش کیا ہے[1]۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی قرآن کی نصوص کی روشنی میں تشریح وتوضیح کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر سب سے بڑا جذبہ محبت کا جذبہ ہے۔ وہ کسی شے سے' کسی ہستی سے یا کسی نظریے اور خیال سے محبت کرتا ہے اور اس کے لیے بھوکا رہنا گوارا کرتا ہے۔ اس کی جبلت میں تو یہ ہے کہ وہ اپنے پیٹ کو بھرے' اپنی ذات کی بقاء (preservation of the self) کے تقاضے پورے کرے۔ لیکن اگر مقصدِ زندگی کی لگن چھا جائے تو انسان فاقے برداشت کرتا ہے۔ یہ جذبہ کسی بھی مقصد کے لیے بروئے کار آ سکتا ہے' وطن کے لیے' قوم کے لیے' کسی نظریے کے لیے' جیسے ماضی میں کیمونزم وغیرہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔

حیوانی جبلت (animal instinct) تو یہ ہے کہ اپنی جان کو بچایا جائے' لیکن انسان کو ہم دیکھتے ہیں کہ کسی محبوب شے کے لیے جان قربان کر دیا کرتا ہے۔ اس کی کئی مثالیں موجود ہیں' جیسے جاپانیوں نے جنگ عظیم میں کیا کہ چھاتہ بردار بم باندھ کر ہوائی جہاز سے کودے اور بحری جہاز کی چمنی میں اتر گئے۔ انہیں معلوم ہے کہ خود ان کے پرخچے اڑ جاتے ہیں مگر ان پر وطن کی محبت چھائی ہوئی ہے۔ انسان کا کوئی نہ کوئی مطلوب ہو' کوئی آدرش ہو' کوئی نصب العین ہو'

---

(۱) اس کا ترجمہ ڈاکٹر ابصار احمد صاحب نے ''منشورِ اسلام'' کے نام سے کیا ہے' جو ''حکمت قرآن'' میں بالاقساط شائع ہوتا رہا ہے اور اب کتابی صورت میں دستیاب ہے۔ (مرتب)

کوئی آئیڈیل ہو' کوئی اس کا محبوب ہو' کوئی اس کا مقصود ہو' اس کے لیے وہ محنت کرے' ایثار کرے' اس کے لیے وہ بھوکا رہے' اس کے لیے وہ راتوں کو جاگے' اس کے لیے وہ جان کا رسک لے' جان قربان کر دے' اس کے لیے وہ پھانسی کے پھندے کو چوم کر گلے میں ڈالے' یہ انسان کا بلند ترین اور سب سے زیادہ قوی جذبہ ہے۔ یہ جذبہ اصل میں اللہ کی محبت کے لیے پیدا کیا گیا ہے' لیکن فکری پستی کی وجہ سے انسان معرفتِ رب تک نہیں پہنچ پاتا۔ تو جیسے شدید بھوک میں آپ کسی گھٹیا غذا کو بھی قبول کر لیں گے جسے عام حالات میں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے' آپ اس کو اضطرار کی حالت میں کھا لیں گے' اسی طرح جب انسان کی نگاہ اُس بلند ترین مطلوب و مقصود تک' اُس highest ideal تک' اُس اصل محبوبِ حقیقی تک نہیں پہنچ سکتی تو وہ کسی اور شے کو اُس کی جگہ رکھ کر اس سے وہی محبت کرنے لگتا ہے جو دراصل اللہ سے ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ اندر کے جذبہ کو تسکین (satisfaction) درکار ہے۔ اُسے تو کوئی نہ کوئی محبوب چاہیے۔ اگر خدا تک نہیں پہنچے گا تو کسی اور شے کو پوجے گا' وطن کو پوجے گا' قوم کو پوجے گا' اپنے ہی نفس کو پوجے گا' اپنے ہی ''حریم ذات'' کے گرد طواف کرتا رہے گا۔

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر
رُست از یک بند تا افتاد در بندے دگر(۱)

اور

اک تصور کے حسنِ مبہم پر ساری ہستی لٹائی جاتی ہے
زندگی ترکِ آرزو کے بعد کیسے سانسوں میں ڈھالی جاتی ہے!

اگر وہ آرزو نہیں رہی' وہ امنگ نہیں رہی' کوئی نصب العین نہیں' کوئی آدرش نہیں' کوئی مطلوب و مقصود نہیں تو پھر یہ انسان محض ایک ''human vegetable'' ہے۔ یہ اصطلاح (human vegetable) آج کل بہت استعمال ہوتی ہے۔ یعنی وہ لوگ جو طبعی طور پر مر چکے ہوں لیکن ان کو مشینوں سے زندہ رکھا گیا ہو کہ دل بھی چل رہا ہے' خون بھی گردش میں ہے اور گردوں کے لیے بھی مشین کام کر رہی ہے' وغیرہ۔ یہ لوگ سالہا سال تک اسی طرح پڑے رہتے ہیں۔

الغرض یہ ہے وہ فلسفہ جو قرآن مجید میں سورۃ الحج کے آخری رکوع میں بایں الفاظ آیا ہے:
﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ﴾ ''بہت ہی کمزور ہے طالب بھی اور مطلوب بھی!''
طالب و مطلوب کا ایک باہمی تعلق (relation) ہوتا ہے۔ انسان کسی بلند شے کو مطلوب

(۱) ہمارا فکر ہر دم نیا خدا تراشتا رہتا ہے..... ایک الجھن سے نکلتا ہے تو دوسری الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔

ومقصود بناتا ہے تو اُس کی اپنی شخصیت بھی بلند ہوتی ہے' لیکن جب اس کی نگاہ پستی پر اٹک جاتی ہے تو پھر اس کی اپنی شخصیت بھی انتہائی پست رہ جاتی ہے۔ بلند آئیڈیل ہوگا تو اس کی شخصیت کو ترفع حاصل ہوگا۔ میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر آپ کو ایک اونچی دیوار پر چڑھنا ہے' کمند آپ کے پاس ہے تو آپ کو اپنے زورِ بازو کے ذریعے پہلے کمند کو اونچا پھینکنا ہوگا۔ جتنی اونچی کمند اٹک جائے گی' اتنا ہی اونچا آپ جاسکیں گے۔ جتنا آپ کا آئیڈیل بلند ہوگا' اتنی ہی آپ کی شخصیت میں بلندی ہوگی۔ قرآن مجید میں جہاں فرمایا گیا کہ اہل ایمان کی شان تو یہ ہے کہ شدید ترین محبت اللہ سے کرتے ہیں' وہاں انسان کی مجبوری اور پستی کے اندر مبتلا ہونے کا ذکر بھی کیا گیا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ﴾ (البقرة:١٦٥)

''انسانوں میں ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا کسی اور کو مدمقابل بنالیتے ہیں' پھر اس سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیے' اور وہ لوگ جو اہل ایمان ہیں وہ شدید ترین ہیں اللہ کی محبت میں۔''

محبوبِ حقیقی اللہ کو ہونا چاہیے تھا' لیکن وہاں تک رسائی نہیں ہوئی تو اس مقام پر کسی اور کو رکھ کر اس کو پوجنا شروع کر دیا' اس سے محبت شروع کر دی۔ یہ انسان کا فطری تقاضا ہے' جس کو وہ ہر صورت پورا کرتا ہے' کسی نہ کسی شے کو اپنا مطلوب ومقصود بنا کر۔ اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے ع ''یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ!'' (کمند کی تشبیہ میں نے یہیں سے لی ہے۔) تمہاری کمند نیچے نہ کہیں اٹک کر رہ جائے' اپنی کمندِ آرزو' اپنی کمندِ طلب کو اتنا اونچا پھینکو کہ وہ ذات باری تعالیٰ تک تمہیں پہنچا سکے۔ ع ''منزلِ ما کبریا است!'' ہمارا مطلوب ومقصود ذات باری تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔

ایک غلطی کی اصلاح: یہاں ایک چھوٹا سا نکتہ مزید واضح کر دوں۔ بعض دینی جماعتوں کے ہاں لفظ ''نصب العین'' غلط طور پر استعمال ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد ہے' اللہ کے دین کی سربلندی کی کوشش ہمارا نصب العین نہیں ہے۔ دراصل نصب العین صرف اور صرف اللہ اور اس کی رضا ہے۔ البتہ اللہ نے جو حکم دیا ہے اس کو بجالانا ہے۔ نماز پڑھنا فرض ہے' پڑھنی ہے۔ روزہ رکھنا فرض ہے' اس کو رکھنا ہے۔ روزہ نصب العین نہیں ہے' نصب العین

اللہ کی رضا ہے۔ سوائے اللہ کی رضا کے کسی شے کو نصب العین کے درجے میں لانا درست نہیں۔ اگر کسی درجے میں لانا بھی چاہیں تو ''فلاحِ اُخروی'' کا لفظ استعمال کر لیں۔ لیکن کسی شے کو فرائض کی فہرست میں سے بلند کر کے نصب العین بنا دینا فکری غلطی ہے' اور پھر اس فکر کے نتائج بہت دور رس نکلتے ہیں۔ اقامتِ دین کی جدوجہد فرض ہے' اس کی کوشش ہمارے ذمہ ہے' تمام شرائط و لوازم کے ساتھ' لیکن اقامت دین ہمارا نصب العین نہیں ہے۔ یہ من جملہ دوسرے فرائض دینیہ کے ایک اہم ذمہ داری ہے۔

(۳) تقرب الی اللّٰہ: اس سلوکِ قرآنی کا تیسرا مرحلہ تقرب الی اللہ ہے۔ یہ تقرب الی اللہ کوئی زمانی یا مکانی سفر نہیں ہے۔ صرف یہی ہے کہ جو حجابات طاری ہیں وہ اُٹھتے چلے جائیں اور قربِ معنوی اللہ سے حاصل ہو جائے۔ یہ فاصلہ زمین پر طے نہیں کرنا ہے' یا خلا میں کروڑوں میل جا کر اللہ سے قرب حاصل کرنا اس کا مفہوم نہیں ہے' بلکہ یہ ہے کہ انسان کا اللہ کے ساتھ ربطِ معنوی مزید پختہ اور گہرا ہو جائے۔

تقرب الی اللہ کے دو راستے

اب اس کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ دنیا میں یہ رہا ہے کہ مجاہدہ مع النفس ہی کے اندر شدید غلو کیا جائے۔ اس کے ذریعہ انسان ضبطِ نفس (self control) تک نہیں بلکہ نفس کشی (self annihilation) تک پہنچ جاتا ہے۔ اسے رہبانیت کہتے ہیں' جس میں تجرد کی زندگی ہے' جس میں دنیا سے انقطاع ہے' جس میں ترکِ دنیا ہے۔ اس میں ذکر کی انتہائی کثرت کے ساتھ مسلسل روزے اور شدید سے شدید تر چلّے ہیں۔ کئی کئی دن کے روزے چل رہے ہیں۔ روزہ نہ بھی ہو تو پابندی ہے کہ نہ کچھ کھانا ہے اور نہ کچھ پینا ہے۔ یہ دنیا کی تاریخ میں ایک بڑا طویل باب ہے' جو آپ کو ہر دور میں ہر جگہ روحانیت کے نام پر نظر آ جائے گا' جس کا جامع عنوان ہے ''رہبانیت''۔ جان لیجیے یہ راستہ اسلام کا نہیں ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں بھی اس کا ایک عکس در آیا ہے۔ الحمد للہ! ہمارے ہاں خانقاہی نظام میں بالکلیہ وہ نظام تو نہیں آیا لیکن اس کا ایک عکس ضرور پیدا ہوا ہے۔ قرآن نے تو رہبانیت کی پرزور نفی کی ہے۔ سورۃ الحدید میں فرمایا:

﴿وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ (الحدید:۲۷)

''اور انہوں (عیسائیوں) نے رہبانیت کا طریقہ خود ایجاد کر لیا تھا' ہم نے تو اُن پر یہ بات لازم نہ کی تھی' مگر وہ اس سے اللہ کی رضا چاہتے تھے' پھر نہ نبھایا اُس کو جیسا کہ اُس کا حق تھا۔''

رسول اللہ ﷺ نے دوٹوک انداز میں فرمایا: ((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ))(۱) ''اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے''۔ نیز فرمایا: ((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ))(۲) ''نکاح میری سنت ہے''۔ آپ نے ان رجحانات کی اول روز ہی سے اصلاح فرمائی ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ عبداللہ ابن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے بارے میں حضور ﷺ کو خبر دی گئی کہ ساری رات نماز میں کھڑے رہتے ہیں' کمر بستر سے لگاتے ہی نہیں' بیوی سے کوئی سروکار نہیں' تمام دن روزہ رکھتے ہیں۔ اس پر حضور ﷺ نے انہیں بلا کر استفسار فرمایا:

((اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّكَ تَقُوْمُ اللَّيْلَ وَتَصُوْمُ النَّهَارَ؟)) قُلْتُ: اِنِّيْ اَفْعَلُ ذٰلِكَ' قال: ((فَاِنَّكَ اِذَا فَعَلْتَ ذٰلِكَ هَجَمَتْ عَيْنُكَ' وَنَفِهَتْ نَفْسُكَ' وَاِنَّ لِنَفْسِكَ حَقًّا' وَلِاَهْلِكَ حَقًّا' فَصُمْ وَاَفْطِرْ' وَقُمْ وَنَمْ))(۳)

''(اے عبداللہ!) یہ میں کیا سنتا ہوں' تم رات بھر قیام کرتے ہو اور دن بھر روزہ رکھتے ہو؟ (حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں) میں نے عرض کیا: جی ہاں' ایسا ہی کرتا ہوں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''(ایسا مت کرو! اس لیے کہ) جب تم یہ طرزِ عمل اختیار کرو گے تو تمہاری آنکھیں بوجھل ہو جائیں گی اور تم تھک جاؤ گے۔ یقیناً تمہاری جان کا بھی حق ہے اور تمہارے گھر والوں کا بھی تم پر حق ہے' چنانچہ روزہ رکھو بھی اور نہ بھی رکھو اور رات کو قیام بھی کرو اور سوؤ بھی۔''

یہ تشدد' یہ غلو' اس کے اندر ریاضت کی شدت' جو دنیا میں رہبانی نظام کا جزو رہا ہے' حضور ﷺ نے سختی کے ساتھ اس رجحان (tendency) کو کم کیا ہے۔

اسی طرح مشہور واقعہ ہے کہ تین صحابہؓ میں یہی جذبہ اُبھرا' انہوں نے آ کر نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے آپ ﷺ کی نفلی عبادات سے متعلق معلوم کیا کہ حضور ﷺ ہر

---

(۱) فتح الباری لابن حجر ۱۳/۹' وفتح الباری لابن رجب ۱۰۲/۱۔
(۲) سنن ابن ماجه' کتاب النکاح' باب ما جاء فی فضل النکاح۔
(۳) صحیح البخاری' کتاب الجمعة' باب ما یکره من ترک قیام اللیل لمن کان یقومه۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب النهی عن صوم الدهر۔

روزے رکھتے ہیں؟ رات کو کتنی عبادت کرتے ہیں؟ اب جو خبر دی گئی تو انہوں نے اسے اپنے اندازے سے کم پایا۔ خیر دل کو تسلی دی کہ حضور ﷺ تو معصوم ہیں' آپؐ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی اور اگر بالفرضِ محال کوئی غلطی ہو بھی گئی ہو تو اللہ تعالیٰ معاف فرما چکا ہے: ﴿لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ﴾ (الفتح: ۲) ہمارے لیے یہ کافی نہیں ہے۔ چنانچہ ایک نے طے کیا کہ میں ساری رات قیام کیا کروں گا اور کمر بستر سے نہیں لگاؤں گا۔ دوسرے نے کہا میں تو ہر روز روزہ رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں کبھی شادی نہیں کروں گا' تجرد کی زندگی بسر کروں گا' شادی بیاہ کا کھکیڑ مول نہیں لوں گا۔ حضور ﷺ تشریف لائے تو آپ کو اس کی خبر دی گئی۔ آپ ﷺ نے ان تینوں حضرات کو بلا کر دریافت فرمایا: کیا تم وہ لوگ ہو جنہوں نے ایسی ایسی باتیں کیں ہیں؟ اس کے بعد حضور ﷺ کی زبان مبارک سے غیر معمولی الفاظ ادا ہوئے: ''خدا کی قسم' میں تم سب سے بڑھ کر متقی ہوں' سب سے بڑھ کر اللہ کی خشیت رکھنے والا ہوں' لیکن میرا طریقہ یہ ہے کہ میں رات کو سوتا بھی ہوں اور عبادت بھی کرتا ہوں' میں روزے بھی رکھتا ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں' اور میں نے عورتوں سے شادیاں بھی کی ہیں۔ پھر فرمایا: ((مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ))(۱) کان کھول کر سن لو' جس کو میری سنت پسند نہیں ہے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔ دراصل یہ طریقہ تو بدھ مت کے بھکشوؤں' جین مت کے سادھوؤں اور عیسائی راہبوں کا ہے اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے بطور ادارہ (institution) اس راستے کو بند کر دیا ہے۔

دوسرا راستہ کیا ہے؟ اس تعبیر پر توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ ہے فرائض کا التزام اور نوافل میں اعتدال۔ مجاہدہ مع النفس کے لیے یہ دونوں کام ضروری ہیں۔ اسلام میں اس مجاہدے کی کیفیت' بھوک اور محنت برداشت کرنے' مشقتیں جھیلنے' لذائذِ دنیا سے کنارہ کشی کرنے اور مصائب برداشت کرنے کو جدوجہد اور کوشش یعنی جہاد فی سبیل اللہ کی طرف منتقل کیا گیا ہے' تاکہ اس پوری قوت اور پوری توانائی (energy) کو کام میں لایا جائے۔ اسے معاشرے کی اصلاح' استحصال (exploitation) کے خاتمے' ظلم کے استیصال' عدل کے قیام' حق کا بول بالا کرنے اور نظامِ عدل و قسط کے قائم کرنے میں استعمال کیا جائے' تاکہ بہت سارے انسانوں کو اس بات کا موقع ملے کہ وہ اپنے ربّ سے لو لگا سکیں۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے

(۱) سنن ابن ماجہ' کتاب النکاح' باب ما جاء فی فضل النکاح۔

فرمایا ہے کہ جس معاشرے میں تقسیم دولت کا نظام غلط ہو جاتا ہے وہاں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جہاں دولت کا ارتکاز ہو گا' وہاں عیاشیاں ہوں گی' وہاں گلچھرے اڑائے جائیں گے' اور جہاں فقر و احتیاج ہو گا وہاں انسان حیوان بن کر رہ جائے گا۔ اعلیٰ خیالات' اللہ کی طرف توجہ و انابت اور اللہ کے ساتھ لو لگانے کا تصور' اس کے حاشیہ خیال ہی سے باہر نکل جائیں گے اور انسان حیوان بن کر رہ جائے گا' لدو اونٹ یا کولہو کا بیل بن کر رہ جائے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے: ((كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَكُوْنَ كُفْرًا))[1] "قریب ہے کہ فقر کفر تک لے جائے"۔ عہد حاضر کے شاعر نے اس کی خوب ترجمانی کی ہے ۔

دنیا نے تیری یاد سے بے گانہ کر دیا
تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے!

بہر کیف قرآن مجید اس قوت کو جو مجاہدہ مع النفس سے حاصل ہوتی ہے' ظلم کے استیصال کے لیے استعمال میں لاتا ہے۔ قرآن کا فلسفہ جو میری سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ عبادات جو فرض ہیں ان کا التزام اور نوافل کے اندر اعتدال ——— اور اس توازن کے ساتھ اصل قوت جو اس سے پیدا (generate) ہوتی ہے اس کا رُخ ظلم کے استیصال کے لیے موڑ دیا جائے۔ لیکن لفظ ظلم کو سمجھ لیں کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ ظلم کے معنی حق تلفی کے ہیں اور سب سے بڑا ظلم شرک ہے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ (لقمٰن) "بے شک شرک ظلم عظیم ہے"۔ اور پھر دوسرا ظلم ہے جو معاشرے میں تین سطحوں پر ہو رہا ہے۔ یعنی سماجی سطح پر یہ اعلیٰ ہے' یہ ادنیٰ ہے' یہ گھٹیا ہے' یہ بڑھیا ہے' کوئی بے چارا پیدائشی نیچ پیدا ہوا ہے اور کوئی اونچا پیدا ہوا ہے۔ یہ تفریق (discrimination) ظلم ہے۔ پھر معاشی سطح پر کچھ لوگ استحصال کرنے والے (exploiters) ہیں اور کچھ لوگ وہ ہیں جو استحصال زدہ (exploited) ہیں۔ کہیں دولت کے انبار لگ رہے ہیں اور دولت مندوں کے کتوں کے لیے جو کچھ ہے وہ غریب کی اولاد کے لیے نہیں ہے۔ اسی طرح سیاسی سطح پر جبر ہے' حاکم اور محکوم کی تقسیم ہو گئی ہے' کچھ حکومت کر رہے ہیں اور کچھ محکوم بن کر رہ گئے ہیں۔ علامہ اقبال نے کہا تھا ع "تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے"۔ بندہ و آقا کی یہ تقسیم درحقیقت بہت بڑا ظلم ہے۔

جان لیجیے' ظلم چاہے اللہ کے ساتھ ہو رہا ہو بشکل شرک' یا ظلم سیاسی سطح پر' سماجی سطح پر یا

(۱) رواه البيهقي في شعب الايمان۔ بحواله مشكاة المصابيح' كتاب الآداب' ۔وضعيف الجامع الصغير وزيادته للالباني' ح:۴۱۴۸۔

معاشی سطح پر ہو رہا ہو' قرآن چاہتا ہے کہ اہل ایمان میں وہ روحانی قوت پیدا ہو جو اس کی اصلاح کر سکے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِينَ امَنُوا كُونُوا قَوّٰمِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (النساء:۱۳۵)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' قائم رہو انصاف پر' گواہی دو اللہ کے لیے۔''

اور

﴿يَاَيُّهَا الَّذِينَ امَنُوا كُونُوا قَوّٰمِينَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾ (المائدة:۸)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' کھڑے ہو جاؤ اللہ کے واسطے انصاف کی گواہی دینے کے لیے۔''

اسی طرح سورۃ الحدید میں ارسالِ رُسل اور ان کے ساتھ انزالِ کتاب و میزان کا مقصد یہ بیان فرمایا گیا: ﴿لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (آیت ۲۵) ''تاکہ لوگ عدل و قسط پر قائم ہو جائیں''۔ ہاں! اگر نظامِ عدل و قسط قائم ہو گیا ہے تو اب موقع ہے' اب آپ تقرب بالنوافل کے اندر جتنی کثرت چاہے کر لیں۔ اس لیے کہ عدل کا ماحول قائم ہو چکا ہے' حق دار کو حق مل رہا ہے' ہمارے ہاں بھی جن حضرات کا ابتداءً اس بات کی طرف رجحان ہوا' وہ اسی لیے تھا کہ انہوں نے دیکھا کہ سیاسی نظام میں جو بگاڑ آ گیا ہے اس کی اصلاح اب ناممکن ہے۔ بار بار کوشش کی گئی' حضرت حسین ؓ کا اقدام' پھر حضرت نفس زکیہؒ کی کوشش' اس طرح کی مختلف کوششیں کی گئیں' لیکن پھر تو اس کے ساتھ ایک طرح سے مصالحت و مفاہمت کر لی گئی اور توجہ کو دوسرے کاموں کی طرف مرتکز کیا گیا۔ اس طرح سے ہمارے ہاں خانقاہی نظام وجود میں آیا۔ لیکن اس میں اصلاح ہوتی رہی۔ انیسویں صدی میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید رحمہما اللہ نے ایک عظیم الشان تحریک اٹھائی جو ''تحریک شہیدین'' کے نام سے معروف ہے۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ سید صاحبؒ سلوک کے تمام سلاسل یعنی نقشبندیہ' سہروردیہ' چشتیہ اور قادریہ میں بیعت کرنے کے بعد اپنے مسترشدین سے ''سلسلہ محمدیہ ﷺ'' میں بیعت لیتے تھے۔ سلسلہ محمدیہ جہاد و قتال والا سلسلہ ہے۔ اس میں اعلاء کلمۃ اللہ کی جدوجہد کے دوران فقر بھی آئے گا' فاقہ بھی آئے گا' تکلیفیں بھی آئیں گی' یہاں روزے کی سی کیفیات بھی آئیں گی' یہاں نفس کے مرغوبات سے محروم ہونا پڑے گا' اور جو نفس کے لیے ناگوار چیزیں ہے' انہیں جھیلنا پڑے گا۔

یہ مجاہدہ مع النفس کا اصل طریقہ ہے۔ ابتدا کی حد تک اس میں وہی عبادات' صلوٰۃ و صوم و زکوٰۃ کا اہتمام ہے' لیکن اس کے بعد اس کے رخ کو تبدیل کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہی

سلوکِ محمدی کی امتیازی شان ہے۔ ہمیں رجوع کرنا چاہیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف۔ ہم ان کو اپنا آئیڈیل سمجھیں گے' وہ سلوکِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مرقع تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت وتزکیہ کا اصل product اور نتیجہ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شخصیات ہیں۔

تقرب بالفرائض اور تقرب بالنوافل حدیث کی روشنی میں

بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایت میں یہ نسبت وتناسب بڑی عمدگی سے بیان ہوا ہے:

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم :((اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَالَ : مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ' وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْہِ ' وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ ' فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ' وَبَصَرَہُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِہٖ' وَیَدَہُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِھَا' وَرِجْلَہُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِھَا' وَلَئِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّہٗ' وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّہٗ)) (۱)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: جس کسی نے میرے کسی ولی سے دشمنی رکھی تو اُس کے خلاف میری جانب سے اعلانِ جنگ ہے۔ اور جن اعمال سے میرا بندہ میرا قرب اختیار کرتا ہے اُن میں سے مجھے سب سے زیادہ محبوب وہ اعمال ہیں جو میں نے اُس پر فرض ٹھہرائے ہیں۔ اور بندہ نوافل کے ذریعے سے میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اُس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ پس جب میں اُس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو اُس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اُس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اُس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے کوئی سوال کرتا ہے تو ضرور اُسے عطا کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرتا ہے تو ضرور پناہ دیتا ہوں۔''

یہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ التزامِ فرائض ضروری ہے' اس ضمن میں یہ واضح رہے کہ فرائض میں عبادات یعنی نماز روزہ' زکوٰۃ اور حج بھی ہیں' فریضہ اقامت دین بھی ہے اور فریضہ

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب التواضع۔

دعوت وتبلیغ بھی ہے۔ اجتماعی فرائض میں اپنی امکانی حد تک ہر شخص مکلّف ہے کہ اس میں حصہ لے۔ اس کے بعد تقرب بالنوافل ۔ مقام ہے۔ اس حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ کے نزدیک قرب کا مقدم درجہ تقرب بالفرائض ہے اور محبوب تر تقرب بالنوافل ہے۔ اگر عدل وانصاف کا ماحول قائم ہو چکا ہو' دین کا بول بالا ہو چکا ہو' ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ (الاسراء) ''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا' بے شک باطل تو ہے ہی مٹ جانے کے لیے'' کی شان ظاہر ہو چکی ہو تو پھر تو پوری قوت کا ارتکاز تقرب بالنوافل ہی پر ہوگا۔ اس طرح کا قرب احادیثِ نبوی ﷺ سے ثابت ہے' ان الفاظ کے اندر کوئی ابہام نہیں۔ اس حدیث کی شرح میں ابن عربیؒ جو بعض حضرات کے نزدیک بہت ہی مبغوض ہیں' نے بہت ہی عجیب بات کہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تقرب بالنوافل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ انسان کا ہاتھ بن جائے' اللہ انسان کا کان بن جائے' اللہ انسان کی آنکھ بن جائے۔ لیکن تقرب بالفرائض کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے' کیونکہ اب وہ انسان دین حق کا بول بالا کرنے میں لگا ہوا ہے' یہ اللہ کا مددگار بن گیا ہے' اُس کا ناصر بن گیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ کی شان یہ ہے: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ۭ﴾ (آل عمران:١٨) ''اللہ نے گواہی دی ہے کہ کوئی معبود نہیں اُس کے سوا' اور فرشتوں نے' اور علم والوں نے بھی' وہی عدل کا قائم کرنے والا ہے''۔ تو جو بھی اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جدوجہد کر رہا ہے' محنت و کوشش کر رہا ہے' گویا وہ اللہ کا ہاتھ بن گیا ہے' اس کا دست و بازو بن گیا ہے۔ وہ اُس کام میں لگا ہوا ہے جو اللہ کو پسند اور محبوب ہے۔ اس کی بہترین تعبیر علامہ اقبال نے فرمائی ہے ؏ ''ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ!'' یعنی دین حق کی اقامت واشاعت کی جدوجہد کرنے والا ایک گروہ جو ''حزب اللہ'' کی شکل اختیار کر لے' یہ لوگ اللہ کے محبوب اور پسندیدہ بندے ہیں۔ اقبال ہی نے ایسے افراد کے بارے میں کہا ہے ؏ ''صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم!'' سورۃ الانبیاء کے الفاظ یاد آ رہے ہیں' فرمایا: ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ﴾ (الانبیاء:١٨) ''ہم ضرب لگاتے ہیں باطل پر حق کے ساتھ''۔ یہ اللہ کی سنت ہے۔ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی!

یہ قوت بنا درحقیقت سلوکِ اسلامی اور سلوکِ روحانی کی معراج ہے۔ اگر کتاب وسنت اور

سیرتِ صحابہؓ سے سلوک کی منازل کو سمجھا جائے تو یہی ہے جو کچھ سامنے آتا ہے۔ چنانچہ تقرب الی اللہ کے لیے دو کام کرنے ہوں گے۔ ایمان میں گہرائی‘ پختگی اور یقین پیدا کرنا ہوگا‘ معرفتِ ربّ پیدا کرنا ہوگی۔ پھر فرائض کے ذریعے اللہ کے قرب کا راستہ طے کریں‘ اُس وقت تک جب تک کہ حق کا بول بالا نہیں ہوجاتا‘ ظلم کا استیصال نہیں ہوجاتا۔ اگر وہ وقت آجائے تو تقرب بالنوافل کا راستہ کھلا ہوگا۔

آخری بات یہ کہ اس سلوک میں قوتِ ارادی درکار ہے۔ جس شخص کے اندر یہ عزم اور ارادہ پیدا ہوجائے‘ اگر وہ خود قوی الارادہ ہے تو ’’قرآن وسنت‘‘ اور ’’سیرت النبی وسیرت صحابہؓ‘‘ ایسی دو آنکھیں ہیں جن سے وہ راستے خود طے کرلے گا۔ لیکن اگر قوتِ ارادی کمزور ہو‘ جیسے کہ اکثر لوگوں کی ہوتی ہے‘ تو کسی قوی الہمت‘ صاحبِ عزیمت شخص کی صحبت اور اس کا قرب درکار ہے‘ اس کے نزدیک رہ کر اس کی مصاحبت کے ذریعے انسان راستہ طے کرسکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: ﴿كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (التوبۃ) ’’سچوں کے ساتھ جڑ جاؤ‘‘۔ دراصل یہ ہے وہ سلسلۂ ارشاد جو چلا آرہا ہے کہ کسی قوی الہمت‘ قوی العزم شخص کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا جائے جس پر دل ٹھک جائے کہ یہ اللہ کا بندہ ہے‘ بہروپیا نہیں ہے‘ یہ واقفِ راہ ہے‘ راستے کے نشیب وفراز کو جانتا ہے‘ جانتا ہے کہاں کہاں غلط موڑ آتے ہیں‘ ایسے شخص کے ساتھ رشتہ استوار کیا جائے۔ اسی کا نام پیری مریدی ہے۔ مرید کہتے ہیں ارادہ کرنے والے کو۔ اگر اللہ تعالیٰ اِسے کسی ایسے شخص تک پہنچا دے جس پر انشراح ہوجائے‘ دل گواہی دے کہ یہ اللہ کا بندہ ہے‘ اس کے اندر خلوص واخلاص ہے‘ یہ مجھے واقعتاً صحیح راہ پر چلائے گا‘ واقفِ راہ ہے‘ دین کا جاننے والا ہے‘ پھر یہ کہ اس دور کے تقاضوں کو بھی جانتا ہے‘ اس دور کی مشکلات سے بھی واقف ہے تو ایسے شخص کے ساتھ تعلق قائم کرلینا یقیناً بہت مفید اور بہت ممد ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے عام مشاہدے کے مطابق ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اسی طرح صحبت اور معیت سے بھی شخصیت پر اثر پڑتا ہے‘ اگرچہ اس کی شرائط کڑی ہیں۔ محض رسماً تعلق قائم کرنا یا خانہ پُری کرنا میرے نزدیک کسی درجے میں مفید نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اپنی سچی معرفت اور تعلق عطا فرمائے۔ آمین!

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات ○○

تنظیمِ اسلامی کا پیغام
نظامِ خلافت کا قیام
تنظیم اسلامی
مروجہ مفہوم کے اعتبار سے
نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ
بلکہ ایک اصولی
اسلامی انقلابی جماعت
ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں
دینِ حق
یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر
نظامِ خلافت
کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!
امیر: حافظِ عاکف سعید حفظہ اللہ

دیگر مطبوعات

انجمن خدامُ القرآن سندھ (قرآن اکیڈمی) کراچی